ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اس شمارے کے ساتھ "میجک فیس"
کا تحفہ مُفت حاصل کیجیے

مئی ۱۹۸۹ء

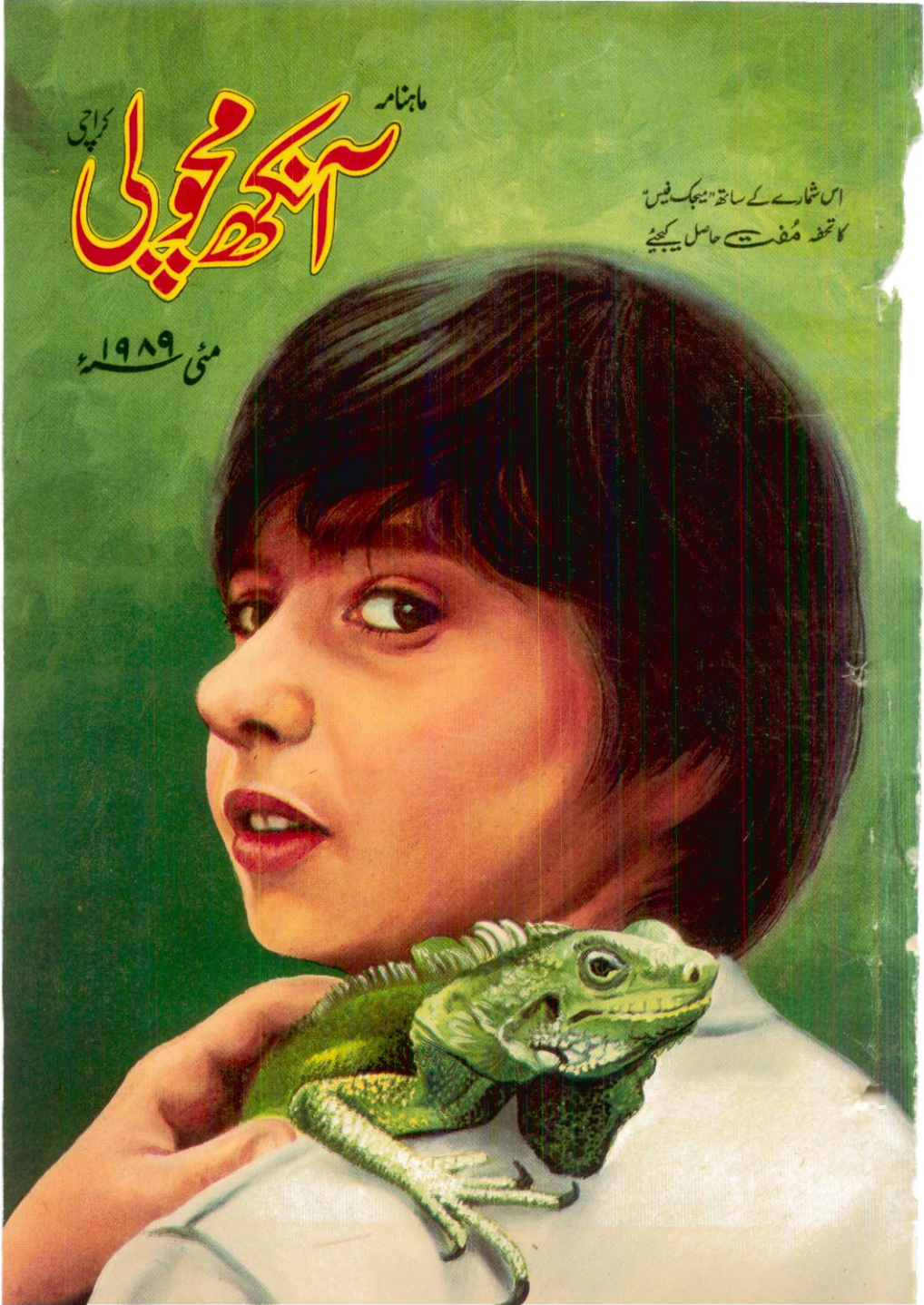

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams
ٹپال چائے
دانے دار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین

B-3 87
ASIATIC

Everyone loves to eat

mayfair Toffees and Sweets

■ Milk Bon Bon ■ Orange Candies.
■ Coconut Candies. ■ Deluxe Toffees ■ Assorted Candies.
■ Tattoo Toffees ■ Honey Candies.

And now another
offer from the house of Mayfair

Milka Chew
Fruta Chew
Minta Chew

mayfair Bubble

You will love it because it is the only juicy bubble that makes

big big Bubbles.

mayfair The Sweet Favourites.

AFI Asian Food Industries (Private) Limited.
Shernaz House, West Wharf Road, Karachi, Pakistan.
Phones: 201612, 201617 Cable: BON BON Telex: 25482 AFI PK

ADARTS AFI 1/86

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

جلد ۳ شمارہ ۱۱ مئی ۱۹۸۹ء رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ

مُدیرِ اعلیٰ: ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول: تجمل حسین چشتی

مُشاورت: مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اعزازی: طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت: شاہ نواز فاروقی، سید خورشید عالم

خطاطی: عارف سعید

ABC آڈٹ بیورو سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

فون نمبر ---- 299178

قیمت ۶ روپے

۴ درہم
۴ ریال

زرِ سالانہ کیلئے خصوصی بچت کا صفحہ دیکھیں

- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
- ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہ[illegible]ر علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲ ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

23 MARCH

On this auspicious occasion
PSO presents
another quality product!

Save your vehicle from an early trip to the scrapyard!

Castrol

RX SUPER

DIESEL ENGINE OIL

- Suitable for all diesel engines
- longer oil change period
- slows down the aging process
- starts engine quickly
- improves performance, increases engine life

Available at all PSO pumps

PSO Pakistan State Oil

PID - Islamabad

حُسنِ ترتیب

- دُعا ۸
- اداریہ ۹
- ڈاکیہ ڈاک لایا ۱۰
- ہم اور ہماری عید — کلیم چغتائی ۱۳
- پاانداز کو مت بھولو — محمدی بیگم ۱۶
- ہم شکل جڑواں افراد — شین فاروقی ۲۱
- آؤ مل کر عید منائیں
- ماں ۲۷
- دنیا میرے آگے (خبرنامہ) ۳۵
- اپنی چال — عامر یونس ۳۷
- لاوارث بچّہ — سیّد خورشید عالم ۴۱
- گاؤں کا راستہ (نظم) — شبیر بیگ ناز ۴۵
- شیرِ میسور — عبدالودود شاہ ۴۷
- برِصغیر میں پہلا اخبار کیسے نکلا؟ — طاہر مسعود ۵۵
- میرا دل تیری دھڑکن — محمد سلیم مغل ۶۱
- جستجو شرط ہے — اسامہ بن سلیم ۶۵
- بھرلور شہد کی مکھی (نظم) — شکیل فاروقی ۷۱
- عکس آخری قسط — شاہنواز فاروقی ۷۲
- وہ ایک تقریر — محمد جاوید خالد ۸۱
- کھٹے میٹھے (منتخب لطائف) ۸۷
- وہ لڑکا — سیّد کاشان جعفری ۹۱
- سائنس انکوائری — نیّر ابدالی ۹۸
- گنی چُنی معلومات — عقیل عباس جعفری ۱۰۰
- ننھّی نگارشات ۱۰۳
- سالگرہ کے ساتھی (قلمی دوستی) ۱۱۶
- امّی ابّو کا صفحہ — شین فاروقی ۱۱۸

دُعا

بارالٰہا، عید کو خوشیوں کا دن بنا
ایک ایسا دن
جو ہمارے گھروں کو امید اور مسرت سے بھر دے
ہمارے میدان اور پارکیں امن کا گہوارہ بن جائیں
وہاں زندگی کے قہقہے گونجیں

خداوندا، عید کو ایسا دن بنا
جس کے بعد آنے والے دنوں میں
کرفیو نہ لگے، گولی نہ چلے، خون نہ بہے
دھماکے نہ ہوں
موت کا وحشیانہ رقص نہ ہو
بھائی بھائی سے گلے ملے
ایک دوسرے کا گلا نہ کاٹے

اے ہمارے معبود، ہمارے اسکول کھلے رہیں
ہمارے بستے کتابوں اور رنگین پنسلوں سے بھرے رہیں
دن میں تتلیاں
اور رات میں جگنو چمکتے رہیں
سب کچھ اچھا لگے سب کچھ اچھا ہے

پروردگار، بزرگوں کا سایہ سر پر قائم رکھ
انھیں دانشمند بنا۔
ان کے گناہوں کو معاف فرما۔

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

گداگری کی لعنت پھیلتی ہی جارہی ہے۔ بازار، چوراہے، گلیاں اور سڑکیں بھیک منگوں سے آباد ہیں۔ جدھر نظر اُٹھائیے بوڑھے جوان، معذور اور ہٹے کٹے، برقعہ پوش عورتیں اور بھولے بھالے بچے ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلائے دکھائی دیں گے۔ وہ پہلے خدا رسول اور قرآن کا واسطہ دیتے ہیں اور پھر اپنی بھوک اور مفلسی کی مَن گھڑت داستان سُنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ گداگروں کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ اب مستحق اور غیر مستحق میں تمیز کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔

گداگروں کی کثیر تعداد ویسے بھی معاشرے کے دامن کو بدنما اور داغ دار کردیتی ہے لیکن سب سے زیادہ اذیت اور دُکھ گداگر بچوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ وہ معصوم بچے جنہیں ابھی گھروں اور اسکولوں کی رونق ہونا چاہیے۔ وہ ایک وقت کی روٹی کا سوال لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ ان میلے کچیلے بچوں سے کوئی پیچھا چھڑانے کے لیے اور کوئی واقعی رحم کھا کر چونّی یا اٹھنّی پکڑا دیتا ہے اور کوئی بُری طرح سے جھڑک دیتا ہے اور وہ اسی سلوک کے عادی ہوجانے کی وجہ سے اپنا مظلوم چہرہ اور پھیلا ہوا ہاتھ لیے کسی اور گاڑی کے آگے سوالی ہوجاتے ہیں۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ایک روز یہ بچے جب بڑے ہوں گے تو اس دھندے کار کے عوض معاشرے کو کیا دیں گے۔؟

اب تک تو یہی تاثر تھا کہ بڑے شہروں میں بردہ فروشوں کے منظم گروہ ہوتے ہیں جو ننھے مُنّے بچوں کو پہلے اغوا کرتے ہیں اور پھر بھیک مانگنے پر مجبور کردیتے ہیں، لیکن اس تشویشناک مسئلہ کا کیا کیا جائے کہ پسماندہ اور مفلوک الحال گھرانوں کے غریب والدین بھی اپنے بچوں کے ہاتھوں میں بھیک کا پیالہ تھما کر انھیں دنیا کی بھیڑ میں دھکیل دیتے ہیں۔ ایسے گھرانوں کی مالی اعانت، انھیں خود کفیل بنانے کی کوشش، اور انھیں بذریعہ قانون اس گھناؤنے فعل سے روکنا صرف حکومت ہی کی ذمے داری نہیں۔ آخر وہ رفاہی اور اصلاحی ادارے کوئی قدم کیوں نہیں اُٹھاتے جو سالہا سال سے قوم کے نام پر چندے وصول کررہے ہیں۔ گداگری ایک پیشہ بن چکا ہے، اور گداگر بچوں کو ابتدائی عمر ہی سے اس کی تربیت دے کر گویا اس بات کا اہتمام کیا جارہا ہے کہ آئندہ چالیس پچاس برسوں میں یہ پیشہ اپنے عروج پر پہنچ جائے۔ اس سلسلے میں ہم حکومت سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے امید رکھتے ہیں کہ آپ اپنے طور پر بچوں میں گداگری کی لعنت کو ختم یا کم کرنے کے لیے جو کچھ کرسکتے ہیں ضرور کیجیے۔ خواہ قول سے خواہ فعل سے، انفرادی طور پر یا مل جل کر، گداگر بچوں کو سمجھا بجھا کر یا ان کے والدین سے رابطہ قائم کرکے، خلوص سے کوشش کی جائے تو کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔

یاد رکھیے! ایک گداگر بچے کی اصلاح معاشرے کے دامن کے ایک داغ کو دھو ڈالے گی۔ خدا آپ کا مددگار ہو۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

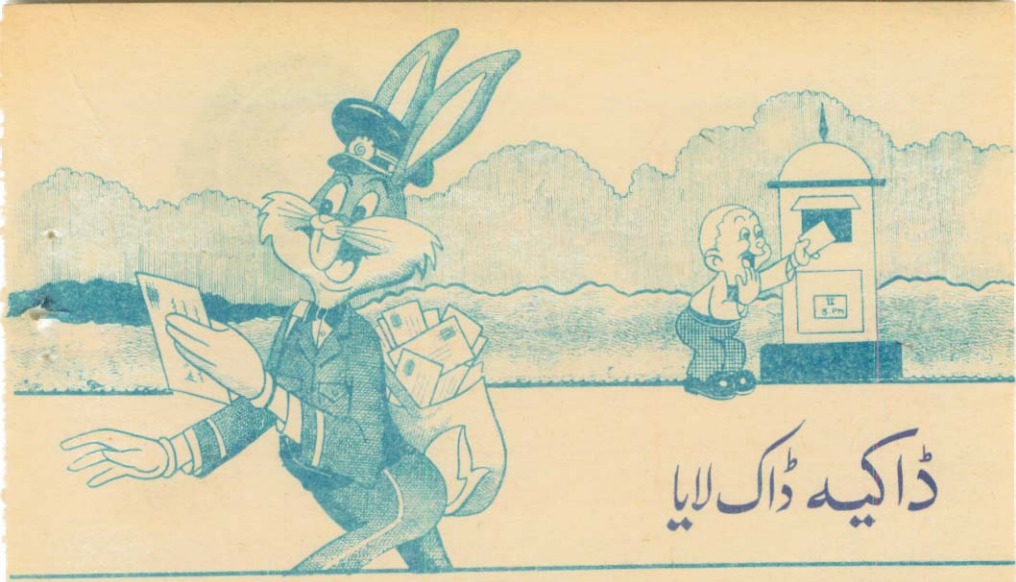

ڈاکیہ ڈاک لایا

الطاف احمد تحصیل کرک، سرحد :۔ پہلے میں اپنے چھوٹے بھائی کو آنکھ مچولی پڑھنے پر ڈانٹتا تھا، بلکہ ایک مرتبہ میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر رسالہ پھینک دیا اس نے لاکھ کہا کہ بھائی صاحب یہ بہت اچھا رسالہ ہے لیکن میں غصّے میں تھا اس لیے میں نے کہا جو بھی ہو تم نہیں پڑھوگے ۔ جب رات ہوئی تو میں نے سونے سے پہلے آنکھ مچولی اُٹھا لیا۔ آپ یقین مانیے میں ساری رات آنکھ مچولی پڑھتا رہا ۔ واقعی یہ بہترین رسالہ ہے ۔ اب میں اپنے بھائی کو منع نہیں کرتا ۔ اب آپ سے یہ فرمائش ہے کہ برائے مہربانی مجھے امیتابھ بچن، ونود کھنہ ، گوندا، آصف رضا میر، محمد علی اور عابد علی جیسے فنکاروں کے پتے بھیج دیجیے ۔

● آپ کے خط کی چند سطریں پڑھ کر ہمیں خوشی ہوئی تھی کہ کم از کم آپ کو اپنے چھوٹے بھائی کی تربیت کا خاصا خیال رہتا ہے لیکن چند ہی لمحوں میں یہ خوشی کافور ہو گئی جب معلوم ہُوا کہ ایک طرف تو چھوٹے بھائی پر یہ سختی ہے اور دوسری طرف آپ خود فلمی اداکاروں کے پتے تلاش کرتے پھر رہے ہیں ۔ چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے رسالہ لے کر پھینکنے سے پہلے اگر آپ اپنی دلچسپیوں پر غور فرما کر ان کی اصلاح کرلیں تو کیا ہی اچھا ہو ۔

حمیرا عاشق رانا، خان گڑھ :۔ جگمگ کرتا ہوا کہانی اسپیشل دے کر تو آپ نے مجھے بے ہوش کر دیا ۔ خدارا ایسے ایڈوانس سرپرائز مت دیا کریں ۔ ورنہ ہمیں کچھ ہو جائے گا ۔ تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں ۔

● کہانی اسپیشل تیار کرنے کے بعد ہم بھی بے ہوش ہو گئے ۔ خاصی محنت جو کرنی پڑی تھی ۔ رہا سرپرائز دینے کا مسئلہ تو بھئی اپنے اعصاب مضبوط رکھیے ۔ اور آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا ۔

نتاشا درانی :۔ آنکھ مچولی میں تاریخی کہانیاں اور ٹی وی پر آنے والے بچوں کے انٹرویو شائع کیے جائیں ۔ ہمیں آپ کے رسالے کی نظمیں کچھ اچھی نہیں لگتیں ۔ ان کا معیار بہتر کیا جائے ۔

● آپ کی فرمائشیں نوٹ کر لی گئی ہیں ۔ آنکھ مچولی کی نظمیں کیوں اچھی نہیں لگتیں ۔ اگر مثال دے کر وضاحت کرتیں تو شاید اس کا بھی کوئی علاج کیا جاتا ۔

سید محمد ۔ کوٹ جس :۔ آپ آنکھ مچولی کا "اسلحہ نمبر" شائع کریں، جن میں اسلحوں کے بارے میں معلومات اور جنگی کہانیاں اور

واقعات ہوں۔ کیا خیال ہے۔

● "اسلحہ نمبر" شائع کیے بغیر ہی ملک میں ہر طرف اسلحہ ہی اسلحہ پھیل گیا ہے اس لیے اب ضرورت ہے کہ ایک شمارہ "امن نمبر" یا "پیغامِ اخوت نمبر" شائع کیا جائے۔ کہیے کیسا؟

رومانہ مشتاق طور، سیالکوٹ :- کیا آپ صرف اپنے رشتے داروں کی تحریریں چھاپتے ہیں۔ حالانکہ میں اپنی سہیلیوں سے کہتی ہوں کہ ہمارے انکل اتنے اچھے ہیں، وہ سب کی تحریریں چھاپتے ہیں۔ میری سہیلیاں مذاق اُڑا کر کہتی ہیں کہ اگر تمہارے انکل اتنے اچھے ہیں تو وہ تمہاری تحریریں کیوں نہیں چھاپتے تو پھر میں لاجواب ہو جاتی ہوں۔

● پیاری بھتیجی صاحبہ! اصل میں آپ کے انکل انصاف پسند ہیں اور اس معاملے میں وہ رشتے داری نہیں معیار دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ ہماری واقعی رشتے داری اچھی تحریروں سے ہے۔ محنت کیجیے انشاء اللہ پھل ملے گا۔

مبارک حسین، حیدرآباد :- آپ نے "خوفناک نمبر" میں لکھا تھا کہ آنکھ مچولی چبائے ہوئے نوالے کو پسند نہیں کرتا۔ اس رسالے میں ایک کہانی "سول لائن ۱۸ نمبر" شائع ہوئی تھی جو مئی ۱۹۸۳ء کے ایک ڈائجسٹ میں شائع ہو چکی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو اپنا اطمینان کریں۔

● بھئی مبارک حسین! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ جس کہانی کا ذکر کر رہے ہیں وہ قدرت اللہ شہاب صاحب کی آپ بیتی ہے جوان کی کتاب "شہاب نامہ" میں چھپ چکی ہے۔ لہٰذا یہ چوری کا مسئلہ نہیں ہے۔ ان کی یہ تحریر بڑوں کے رسالے میں بہت پہلے چھپ چکی تھی، بچوں کے رسالے میں سب سے پہلے ہم نے چھاپی۔ امید ہے اس وضاحت سے آپ مطمئن ہو جائیں گے۔

ضیاء شہزاد، ساھیوال :- میرا گلہ صرف آپ سے نہیں تمام رسالوں سے ہے کہ وہ طلبا کو ان کے اصل مقصد سے دُور کر دینے کے جُرم میں برابر کے شریک ہیں۔ طالب علم کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہ کس طریقے سے امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ ایک طالب علم کا پہلا مقصد امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ اور آپ لوگ ہیں کہ اپنے رسالے کے قیمتی صفحات قصے کہانیوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔

● آپ کے طویل خط کے جواب میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آنکھ مچولی میں گیس پیپرز شائع کیا کریں۔۔۔ میرے عزیز۔ جو تعلیم صرف امتحان پاس کرنے کے لیے حاصل کی جاتی ہے، اُسے امتحان کے بعد طلبا بُھلا دیتے ہیں اور جو خیالات ہم کہانیوں اور مضامین کے ذریعے ان تک پہنچاتے ہیں وہ زندگی بھر ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم مطمئن ہیں کہ اپنے "قیمتی صفحات" ضائع نہیں کر رہے ہیں۔

غلام حسین میمن، حیدرآباد :- اب آپ "آزادی نمبر" اور "کمپیوٹر سائنس نمبر" نکالنے پر بھی غور کیجیے "کہانی اسپیشل" کی کہانیوں میں حسینہ معین کی بے ساختگی پسند آئی، باقی کہانیاں بھی ایسی تھیں۔ جن کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

● "کہانی اسپیشل" کی پسندیدگی ہماری محنت کا صلہ ہے۔ آپ کی تجویزیں اچھی ہیں۔ کبھی نہ کبھی اسے عملی جامہ پہنا دیں گے۔

شفاقت علی عاجز، اولکھ بھاٹیکے ضلع گجرات :- اگر آپ نے میرا خط فروری کے شمارے میں شائع کر دیا تو میں آپ کو ٹافیاں بھیجوں گا اور اگر آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو میں اپنے خط کے اسّی پیسے واپس لینے کے لیے کراچی آ جاؤں گا چاہے مجھے پانچ سو روپے خرچ کرنے پڑیں۔

● لیجیے آپ کا خط ہم تین ماہ بعد شائع کر رہے ہیں تاکہ آپ یہ نہ کہہ سکیں کہ ٹافیوں کے لالچ میں کیسا فوراً جواب دینے پر تیار ہو گئے۔ لیکن یہ بتائیے کہ ہم آپ کو جواب کیا دیں۔ آپ نے تو کچھ لکھا ہی نہیں سوائے اس کے کہ رسالہ پسند آیا۔ اچھا صاحب شکریہ!

ارسلان ظہیر ڈار، گجرات :- مجھے سائنس سے بہت لگاؤ ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ سائنس نمبر نکالیے۔ مہربانی ہوگی۔

● بھئی اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ نمبر وغیرہ نکالنا تو ہم لوگوں کا مشغلہ بلکہ فریضہ ہے۔ آپ کہتے ہیں تو کبھی سائنس نمبر بھی نکال دیں گے۔

عمران خان۔ شہر کا نام نہیں لکھا،۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ بچوں کی فرمائشوں پر غور نہیں کرتے۔ میں نے دو خط ارسال کئے تھے کہ آپ برائے مہربانی "انسانیت" پر مضمون شائع کریں۔ خدارا آپ میری فرمائش کو رد نہ کریں۔

● دیکھئے جناب "انسانیت" جو ہے نا یہ تو ہر انسان کے اندر مضمون پڑھے بغیر ہی ہونی چاہیے۔ اگر ہمیں کوئی مضمون نگار ایسا ملا جس کے اندر انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آئی تو ہم اُس سے اس موضوع پر مضمون ضرور لکھوائیں گے۔ ٹھیک ہے؟

محمد عادل منہاج، کراچی؛ کہانی اسپیشل پڑھ کر محسوس ہوا کہ جیسے پاکستان میں کہانیوں کا کال پڑ گیا ہے کیونکہ پورے رسالے میں غیر ملکی کہانیوں کی بھرمار تھی۔ آئندہ آپ "پاکستان نمبر" نکالیں۔ اور ہاں ڈاکٹر جمیل جالبی کی کہانی کو سچا بتایا گیا ہے حالانکہ اس کا حقیقت سے تو دُور کا بھی واسطہ نظر نہیں آرہا تھا۔

● ہم نے کہانی اسپیشل میں اعلان کیا تھا کہ اس میں دیس بدیس کی پچاس کہانیاں ہوں گی۔ آپ یہ سمجھ بیٹھے کہ ساری کہانیاں غیر ملکی ہیں حالانکہ آپ ذرا گننے بیٹھیں تو اپنی بات آپ کو خود غلط نظر آئے گی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی کہانی سو فیصدی سچی ہے۔ بعض واقعات کو واقعی عقل تسلیم نہیں کرتی۔

> ● اکثر ساتھی اپنے خطوط میں پوچھتے ہیں کیا ہم آپ کو کہانی بھیج دیں۔ نظم، انٹرویو یا مزاحیہ مضمون ارسال کر دیں۔ کیا آپ چھاپ دیں گے۔ ان تمام ساتھیوں کی اطلاع کے لیے ایک بار پھر واضح کیا جا رہا ہے کہ کوئی تحریر بھی بھیجنے کے لیے پہلے سے اجازت لینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ آپ کی تحریر اگر معیاری ہوئی تو ہر صورت میں شائع ہوگی۔ اپنی تحریروں کی اشاعت کے لیے عجلت پسندی کا مظاہرہ نہ کیجیے۔ صبر و سکون سے کام لیجیے، ہمیں روزانہ بے شمار تحریریں موصول ہوتی ہیں۔ ان سب کو باری آنے پر ہی پڑھا جا سکتا ہے۔
>
> ادارہ

عابد جمیل انصاری، ٹوبہ ٹیک سنگھ،۔ سو روپیہ ادھار لے کر آنکھ مچولی کا خریدار بنا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا رسالہ واقعی پسند آیا۔ اب یہ بتائیے کہ میں مزاح نگار ہوں تو کیا ہر مہینے آپ میری ایک مزاحیہ تحریر چھاپ دیا کریں گے؟ ایک تجویز یہ ہے کہ ہر مضمون نگار کے نام کے ساتھ اس کے شہر کا نام بھی ہونا چاہیے۔

● ہمیں معلوم ہوتا کہ ایسی صورتحال ہے تو شاید ہم اپنی جیب سے آپ کو خریدار بنا دیتے۔ ہم واقعی آپ کے جذبے سے متاثر ہوئے۔ آپ کی مزاحیہ تحریر ہم شوق سے چھاپیں گے لیکن ہر مہینے کی شرط کڑی ہے۔ آخری تجویز پر غور کیا جا سکتا ہے۔

صائمہ حیدر، کراچی،۔ میرا مضمون فوراً شائع کر دیجیے گا تاکہ میں اپنا سر فخر سے اُٹھا سکوں۔ فخر سے میری مراد غرور نہیں ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔

● چونکہ ہم آپ کا مضمون فوراً شائع نہیں کر سکے اس لیے ہمارا سر شرمندگی سے نیچا ہے۔ حالانکہ ہم نے تو غرور بھی نہیں کیا تھا۔ بہرکیف آپ کی تحریر ننھی نگارشات میں چھپ جائے گی۔

وسیم عباسی، سیالکوٹ،۔ میں آنکھ مچولی کو دوسرے رسالوں پر اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ یہ رسالہ کبھی یکسانیت کا شکار نہیں ہوا۔ اگر آپ بُک اسٹال پر لگے رسالوں پر نظر دوڑائیں تو ایک رسالہ آپ کو سب سے مختلف نظر آئے گا اور وہ ہے آنکھ مچولی۔

کلیم چغتائی

ہم اور ہماری عید

کلاس روم کا منظر جس کے طلبا ایک معلوماتی مقابلے میں شریک ہیں۔

اُردو کے ٹیچر ہاشمی صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے تو تمام لڑکے تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہاشمی صاحب نے اشارے سے سب کو بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے مُسکراتے ہوئے پوری کلاس پر نظر ڈالی اور بولے۔

"ہاں بھئی، آج رمضان المبارک کی تیس تاریخ ہے، برکتوں والا یہ مہینہ اب رخصت ہو رہا ہے۔ اس کا آخری عشرہ یعنی آخری دس دن تو بہت اہم ہوتے ہیں، کیونکہ ان دس دنوں میں ہی ہمیں شبِ قدر

کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں نے روزے، تو پورے رکھے نا؟"

"جی ہاں..." تمام لڑکوں نے کورس میں جواب دیا۔

"شاباش، اچھا بھئی، عید کے موقعے پر میں آپ لوگوں کو ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں، لیکن میں یہ تحفہ یوں ہی نہیں دوں گا، اس کے لیے باقاعدہ مقابلہ ہوگا۔"

"کس چیز کا سر؟ جو ڈوکرائے گا؟" جمیل نے جو بہت شریر تھا، جھٹ سے پوچھا۔

"نہیں نہیں، جسمانی لڑائی نہیں بلکہ ذہنی لڑائی کا مقابلہ، ہم ایسا کرتے ہیں کہ آج ایک مقابلۂ معلومات رکھ لیتے ہیں۔ یہ مقابلہ دو گروپس کے درمیان ہوگا۔ گروپ اے میں میرے دائیں ہاتھ والی بنچوں کے لڑکے ہوں گے اور گروپ بی میں، میرے بائیں ہاتھ والی بنچوں کے لڑکے شامل ہوں گے۔ ٹھیک ہے؟ میں سوال کروں گا۔ ہر سوال کے پانچ نمبر ہوں گے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سارے سوالات عید کے بارے میں ہوں گے۔"

"اور سر تحفہ کیا ہے؟" رشید نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہی بتا رہا ہوں، جو گروپ مقابلہ جیت لے گا، وہ اس کپ کا حق دار ہوگا۔" ہاشمی صاحب نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک چمکتا ہوا کپ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ لڑکے سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"اچھا بھئی، گروپ اے سے سوال، بتائیے عید الفطر کب سے منائی جا رہی ہے؟"

نسیم نے ہاتھ بلند کیا "سر یہ حضرت آدمؑ کے زمانے سے منائی جا رہی ہے۔"

"غلط... اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہجرت کے بعد سے منائی جا رہی ہے۔ جب حضورِ اکرمؐ ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچے تو آپؐ نے دیکھا کہ مدینہ منورہ کے لوگوں نے سال میں دو دن مقرر کیے ہوئے ہیں۔ جن میں وہ کھیل تفریح کرتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ دو دن کیسے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ہم اسلام سے پہلے ان دنوں میں تفریح کرتے اور خوشیاں مناتے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا، اللہ نے ان دو دنوں کے بدلے ان سے بہتر دو دن مقرر فرمائے ہیں۔ ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ۔" اب بی گروپ سے سوال، بتائیے نمازِ عید کب سے ادا کی جا رہی ہے؟"

مہتاب نے ہاتھ بلند کیا اور اجازت ملنے پر بولا "سر دو ہجری میں رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تھے، ان کے بعد یکم شوال کو پہلی بار عید کی نماز باجماعت ادا کی گئی۔"

"بالکل ٹھیک، شاباش۔ گروپ بی کے پانچ نمبر ہو گئے۔ مانیٹر ذرا بلیک بورڈ پر یہ نمبر لکھ دینا۔" مانیٹر

نے اُٹھ کر نمبر لکھ دیے۔

ہاشمی صاحب نے چشمہ اُتار کر میز پر رکھتے ہوئے کہا "گروپ اے سے سوال، بتائیے عید الفطر کیوں منائی جاتی ہے؟"

کلاس کا سب سے صحت مند لڑکا جمال اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "سر ایک تو یہ کہ رمضان المبارک میں قرآن پاک نازل ہوا، دوسرے یہ کہ مسلمان اس ماہ میں روزے رکھتے ہیں، تراویح پڑھتے ہیں اور اللہ کی عبادت زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں تو اس خوشی میں عید مناتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک اور اس سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں اتحاد کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے" ہاشمی صاحب نے جمال کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، "گروپ اے کے بھی پانچ نمبر لکھیں بھئی... اور مانیٹر اب تم درست جواب آنے پر لکھتے رہنا۔ گروپ بی سے سوال، بتائیے صدقۂ فطر یا فطرہ کیا ہوتا ہے۔ آپ بتائیے ضمیر، آپ بڑی دیر سے ہاتھ اُٹھا رہے ہیں۔"

ضمیر اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بولا "سر ہر مسلمان مرد اور عورت کو عید کے دن فجر سے پہلے پہلے کچھ رقم غریبوں کو دینی ہوتی ہے۔ یہ فطرہ کہلاتا ہے۔"

"کتنی رقم؟"

"سر یہ تو صحیح پتا نہیں۔"

"خیر، چلیے میں آپ کا جواب درست مانے لیتا ہوں۔ دراصل فقہا نے تقریباً دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت دینے کے لیے کہا ہے۔ یہ اس لیے عید سے پہلے دیا جاتا ہے کہ کوئی غریب اگر عید کی تیاری نہ کر سکا ہو، نیا لباس نہ بنوا سکا ہو تو وہ بھی عید کی کچھ تیاری کر لے اور اُسے بھی خوشی ہو، بہت سے لوگ عید کی نماز کے بعد فطرہ ادا کرتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ اچھا بھئی گروپ اے بتائیے، وہ کون سے کام ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن فرمایا کرتے تھے۔ کوئی سے پانچ بتا دیں۔"

"جی سر مجھے معلوم ہے۔" احتشام نے جلدی سے کہا "غسل کرنا، مسواک کرنا، اچھے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا اور... اور عید گاہ میں بہت جلدی پہنچنا۔"

"واہ بھئی احتشام آپ کی تو یادداشت بہت اچھی ہے۔ اب گروپ بی مزید ایسے کام بتائیے جو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے روز انجام دیا کرتے تھے۔"

نوشاد کھڑا ہوگیا اور کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد بولا "سر عید گاہ جانے سے پہلے فطرہ ادا کر دینا

عید گاہ جانے سے پہلے سویاں کھانا، عید کی نماز عید گاہ میں پڑھنا، اور سر ایک راستے سے پیدل عید گاہ جانا اور دوسرے راستے سے واپس آنا۔"

بالکل درست ہے، اس میں ایک بات واضح کر دوں، نوشاد نے بتایا کہ عید گاہ جانے سے پہلے سویاں کھانا سنّت ہے، تو اصل بات یہ ہے کہ کوئی سی بھی میٹھی چیز کھانا سنّت ہے، سویوں کی پابندی نہیں ہے۔ اب گروپ اے کی باری ہے، بتائیے عید کی نماز کی آذان، نماز سے کتنی دیر پہلے ہوتی ہے؟"

"سر ایک گھنٹہ پہلے" نسیم نے کہا۔

"جی نہیں عید کی نماز کی اذان نہیں ہوتی۔ گروپ بی بتایئے عید کی نماز میں کتنی زائد تکبیریں ہوتی ہیں"

"سر چھ ہوتی ہیں" مہتاب نے بتایا۔

"درست ہے، اب گروپ اے والے جواب دیں، کیا عید کے دن روزہ رکھا جا سکتا ہے؟"

"نہیں سر، عید کے دن روزہ رکھنا کون پسند کرے گا" جمال نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"جواب تو درست ہے لیکن یہ پسند ناپسند کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عید کے دن روزہ رکھنے سے خود منع فرمایا ہے۔ اچھا بھئی گروپ بی، ذرا یہ بتایئے کہ اگر کسی وجہ سے آپ کو عید کے دن عید گاہ پہنچنے میں دیر ہو گئی اور آپ جب عید گاہ پہنچے تو نمازی گلے مل رہے تھے تو کیا آپ گھر جا کر اکیلے، عید کی نماز ادا کر سکتے ہیں؟"

"جی ہاں سر کیوں نہیں" دُبلے پتلے فیروز نے کہا "میں نے خود پچھلے سال گھر آ کر نماز پڑھی تھی۔"

"جی نہیں فیروز صاحب، آپ نے غلطی کی۔ آپ کے گھر والوں کو چاہیے کہ آپ کو صحیح بات بتاتے عید کی نماز ادا کرنے کے لیے جماعت شرط ہے ... ہاں بھئی ذرا بورڈ کی پوزیشن دیکھیں۔ ہم نے دونوں گروپوں سے پانچ پانچ سوال کیے۔ گروپ اے نے تین سوالوں کے درست جواب دیے اس طرح اسے پندرہ نمبر ملے۔ گروپ بی کے چار جواب درست تھے۔ اس طرح اس نے بیس نمبر حاصل کر کے آج کا کپ جیت لیا ہے۔ گروپ بی کو یہ کامیابی مبارک ہو۔ خیر اس طرح کی ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے، پھر کبھی کوئی مقابلہ کروائیں گے اس میں گروپ اے والے ذرا تگڑی تیاری کر کے آئیں۔ تو ممکن ہے میدان ان ہی کے ہاتھ رہے۔ اچھا بھئی" ہاشمی صاحب نے چشمہ اُٹھا کر پہن لیا۔

"آپ سب کو عید کی پیشگی مبارک باد! انشاء اللہ عید کی چھٹیوں کے بعد ملاقات ہوگی۔"

اسی وقت چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔

محمدی بیگم

پا انداز کو مت بھولو

بارش کا دن تھا۔ صبح سے مینہ برس رہا تھا۔ راستے میں کیچڑ ہو رہی تھی چلنے والے پھسلے پڑتے تھے اور بُوٹ کیچڑ میں بھرے بغیر چلنا ناممکن تھا۔

موہن اور لیلاوتی دونوں اکٹھے مدرسے سے آئے اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑے اُتار کر بڑے آرام سے آگ کے آگے بیٹھ کر ہاتھ پیر سینکنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ان کی ماں باورچی خانے میں گئی اور اُن کے بوٹوں کے نشان فرش پر دیکھ کر بہت بگڑی۔ دروازے سے لے کر انگیٹھی تک

کیچڑ میں بوٹوں کے نشان تھے۔ وہ بولی "دیکھو موہن اور لیلا۔ تم دونوں نے اس کمرے کا ستیاناس کر دیا۔ اب یہ مجھے پھر دھونا پڑے گا۔ کیا تم ان حرکتوں کو اچھا سمجھتے ہو؟"

موہن نے جواب دیا "اماں جان گلیاں اس قدر کیچڑ سے بھری ہیں کہ پاؤں گیلے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔"

ماں نے جواب دیا "میں مانتی ہوں۔ یہ بالکل سچ ہے۔ میں یہ الزام نہیں دیتی کہ بارش تھی۔ تو تم آئے کیوں۔ نہ میں تم سے یہ امید رکھتی ہوں کہ ایسے موسم میں تم اپنے بوٹ صاف رکھو۔ میں تو صرف یہ کہتی ہوں کہ "پائنداز کو مت بھولو" کمرے میں آنے سے پہلے اپنے بوٹ رگڑ لو۔ سب کیچڑ باہر رہ جائے گی۔ میں نے آج اس کمرے کو صاف اور ستھرا کرنے میں کئی گھنٹے خرچ کیے۔ اور پائنداز دروازے میں رکھا۔ لیکن تم دونوں سیدھے اس کے اوپر کو چلے آئے اور میرے بنے بنائے کام کو بگاڑ دیا۔ اگر تم ایک منٹ ٹھہر کر اپنے بوٹ صاف کر لیتے تو باورچی خانے کا فرش ویسا ہی ستھرا رہتا۔ جیسا میں نے دھو کر کیا تھا۔"

بہن بھائی دونوں کو نہایت رنج ہوا کہ ایک منٹ کی بے احتیاطی نے اتنی خرابی کی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ پھر کبھی وہ گیلے بوٹ لے کر آئیں گے۔ تو پائنداز کو یاد رکھیں گے۔

ان کی ماں نے کہا "صرف یہی نہیں۔ اگر تم صرف گیلے دنوں ہی میں بوٹ صاف کرنے کا ارادہ کرو گے تو تمہیں یہ عادت نہ پڑ سکے گی۔ ہمیشہ بھول ہو جایا کرے گی۔"

موہن نے پوچھا "تو اور کیا کریں؟"

ماں نے جواب دیا "بوٹ ہمیشہ صاف کرو۔ خواہ بارش ہو یا کھلا دن ہو۔ تمیز دار آدمی کسی گھر میں کسی دن بھی بوٹ کو پائنداز پر رگڑے بغیر داخل نہیں ہوتے۔ گھر، مدرسہ، مندر، صاف دنوں میں بھی بازار یا سڑک سے زیادہ صاف ہوتے ہیں۔ پس ہر شخص کو خیال رکھنا چاہیے کہ وہ گرد کو باہر کی چٹائی یا پائنداز پر صاف کرلے۔"

موہن اور لیلا کو پہلے اس بات کا خیال نہیں تھا۔ اب انہوں نے جان لیا کہ اگر ہم اس نصیحت پر چلیں گے تو بہت سا کام ماں کو نہیں کرنا پڑے گا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ اب سے ہمیشہ بوٹ رگڑ لیا کریں گے۔

ہر لڑکے اور لڑکی کو یوں ہی کرنا چاہیے۔

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے

واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ

احمد کے حلوہ جات

ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے

MAGIS

آپ نے اتنے جُڑواں اور ہم شکل افراد یکجا
نہیں دیکھے ہوں گے۔ کہیے کیا خیال ہے

حیران کُن حد تک ہم شکل اور جُڑواں شوہروں
کی ہم شکل بیویاں۔ آپ کو یقین آیا یا نہیں؟

شین فاروقی

ہم شکل جڑواں افراد

دلچسپ اور حیران کر دینے والے انکشافات

کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں اتفاق کو بڑا دخل ہے۔ مثلاً یہ اتفاق ہی ہے کہ ہم ہر روز کراچی کی سڑکوں پر چل پھر کر زندہ حالت میں گھر پہنچ جاتے ہیں اسے بھی ہم اتفاق ہی کہیں گے کہ ہمارے ڈیڈی ہمیں محنتی اور سمجھ دار بچہ تصور کرتے ہیں اور کیا یہ بھی محض اتفاق نہیں کہ آپ کے لیے یہ مضمون ہم لکھ رہے ہیں ورنہ یہ مضمون کوئی اور بھی تو لکھ سکتا تھا۔ وغیرہ

دنیا میں بہت سے ہمشکل جڑواں بچے بھی اتفاق ہی سے ہمشکل پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے پاس پڑوس میں رہنے والے ایسے بچوں یا بڑوں سے واقف ہیں تو یقیناً آپ نے اُن کے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں بھی ضرور سُنی ہوں گی۔ بلکہ ممکن ہے کہ آپ نے ان دلچسپ باتوں سے خود بھی لطف اُٹھایا ہو۔ تاہم اگر آپ نے ہمشکل جڑواں افراد کے متعلق کچھ سُنا یا دیکھا نہیں ہے تو آیئے ہم ایسے افراد سے متعلق بعض دلچسپ حقائق اور واقعات سے آپ کو آگاہ کرتے ہیں۔

امریکہ کے دو ہمشکل جڑواں بھائی جم اسپر نگر اور جم لیوس ایک دوسرے سے اُس وقت جُدا ہو گئے تھے جب اُن کی عمر صرف چھ ہفتے تھی۔ حسنِ اتفاق سے انتالیس برس بعد امریکی ریاست منی سوٹا کی ایک یونیورسٹی نے ہمشکل جڑواں افراد پر تحقیقات کا پروگرام بنایا تو یہ دونوں حضرات بھی وہاں بُلائے گئے۔ وہاں پہنچ کر اُنھیں معلوم ہوا کہ وہ دونوں واقعتاً بچھڑے ہوئے بھائی ہیں (ایسے مناظر اکثر ---- فلموں میں دکھائے جاتے ہیں) تحقیقات کرنے والے افراد نے جب ان دونوں کی زندگی کی دیگر تفصیلات دریافت کیں تو کئی اور حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ مثلاً یہ کہ دونوں بھائی اس وقت تک دو شادیاں کر چکے ہیں۔ دونوں کی بیگمات، بچوں اور کتوں کے نام ایک ہیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ دونوں ایک ہی کمپنی کی ایک جیسی ماڈل کی کاریں استعمال کرتے ہیں اور اکثر پکنک منانے کے لیے ایک ہی ساحل پر جاتے ہیں۔

ان دونوں بھائیوں کی زندگیوں میں یہ مشابہت حیران کُن ہے۔ تاہم ماہرینِ جینیات کے بقول یہ بات اتنی حیران کُن بھی نہیں ہے، کیونکہ ماہرین کے مطابق انسانوں کے اندر بعض ایسے جینز پائے جاتے ہیں جو انسانوں

کی پسند و ناپسند کو متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ہمشکل جُڑواں لوگوں میں یہ جینز بہ یک وقت موجود ہوتے ہیں، جس کے باعث نہ صرف یہ کہ ان کی شکل وصورت بلکہ عادات اور پسند و ناپسند میں حیرت انگیز مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ ہم شکل جُڑواں لوگ جہاں ایک جیسے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے قریبی تعلق محسوس کرتے ہیں وہیں اُن میں اکثر ایک دوسرے کے لیے شدید رقابت کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ تاہم ماہرین کے مطابق جُوں جُوں ایسے لوگوں کی عمر بڑھتی جاتی ہے ان لوگوں کے درمیان محبّت اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ امریکہ کے دو ایسے ہی ہمشکل جُڑواں بھائیوں سے جب اُن کے تعلق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کامل یقین کے ساتھ کہا کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی بیگمات سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

ہمشکل جڑواں لوگ نہ صرف یہ کہ اپنی شخصیات کے بارے میں بہت حسّاس اور باشعور ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے ہمشکل اور جُڑواں ہونے پر فخر بھی کرتے ہیں۔ اس احساس کے زیرِ اثر امریکہ میں ہمشکل جڑواں افراد کی ایک بین الاقوامی نوعیّت کی ثقافتی انجمن قائم کی گئی ہے۔ یہ انجمن ہر سال اپنا ایک خصوصی تہوار مناتی ہے۔ اس برس اس تہوار میں دنیا بھر سے تیرہ سو ہمشکل جُڑواں افراد نے شرکت کی تھی۔ امریکہ سے ہی ایسے افراد کی نمائندگی کرنے والا ایک میگزین بھی شائع ہوتا ہے جس کا نام "TWINS" ہے۔

ہمشکل جُڑواں افراد کی زندگی پر ہونے والی تحقیقات سے پتا چلا ہے کہ یہ افراد ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لیے ایک ایسی مخصوص زبان ایجاد کر لیتے ہیں جسے اُن کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ماہرین کے بقول ۴۰ فیصد بچّے اس مخصوص زبان کو ایجاد کر کے استعمال کرتے ہیں۔ البتّہ پانچ چھ برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد ہمشکل جُڑواں بچّے یہ مخصوص زبان بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔

اگرچہ ایسے لوگوں کے مزاج اور عادات واطوار، سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ اور طریقوں پر بہت سی باتیں تحقیق کے ذریعے معلوم ہو چکی ہیں، اس کے باوجود ان لوگوں کے بعض مشترکہ تجربات ابھی تک معمّہ بنے ہوئے ہیں۔ اب سے کچھ برس پہلے ڈونلڈ کیتھ نام کے ایک شخص نے سرِراہ چلتے چلتے اپنے جسم کے ایک مخصوص حصّے میں شدید درد محسوس کیا۔ شام گئے جب ڈونلڈ کیتھ اپنے ہمشکل جڑواں بھائی لوئس سے ملا تو معلوم ہُوا کہ اُسے بھی جسم کے اُسی حصّے میں اُسی مخصوص وقت پر شدید درد محسوس ہُوا تھا۔

جُڑواں افراد میں پائے جانے والے اس مشترک احساس کے بارے میں ڈونلڈ کیتھ کا کہنا ہے کہ چونکہ ہمشکل

لیورپول (برطانیہ) کی یہ "چھ جڑواں" بہنیں اپنی نوعیت کی واحد لڑکیاں ہیں۔ جو اپنی پیدائش سے آج تک اللہ کے فضل وکرم سے زندہ ہیں۔ اب یہ چھ برس کی ہو چکی ہیں۔ دائیں طرف ان بچیوں کے امی ابو ہیں جنہوں نے پیدائش کے بعد انہیں گود میں اٹھایا ہوا ہے۔ ان بچیوں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔ دائیں سے بائیں۔ سارہ، رُتھ، کیٹ، لوسی، جینی اور حنا۔

جُڑواں افراد ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کے ساتھ ایک جیسے واقعات رُونما ہوتے ہیں۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں اگر یکسوئی کے ساتھ کوئی بھی بات سوچنا شروع کر دے تو وہ بات اُس کے بھائی تک خود بخود پہنچ جائے گی۔

جینیاتی سائنس نے جُڑواں افراد کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ افراد جو ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ہمشکل نہیں ہوتے۔ اور دوسرے وہ لوگ جو ایک ساتھ پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جیسی شکل وصورت بھی رکھتے ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق دنیا میں پیدا ہونے والے جُڑواں بچّوں کا ایک تہائی ہمشکل لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں ۹ کروڑ جڑواں افراد موجود ہیں۔

تقریباً ایک صدی سے ماہرین جُڑواں افراد پر اس معمّے کو حل کرنے کے لیے تحقیقات کر رہے ہیں کہ جینئس انسان شخصیت کی تعمیر میں کیا کردار ادا کرتے ہیں؟ تحقیقات کے لیے ماہرین جڑواں بچّوں کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کر کے مختلف ماحول میں پرورش کر رہے ہیں۔ اس عمل کے ذریعہ ماہرین یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انسانی شخصیت پر جینئر اور عام بیرونی یا معاشرتی ماحول کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں منی سوٹا یونیورسٹی کے ایک تحقیقاتی بورڈ نے ۱۷ جُڑواں لوگوں پر تحقیق کے ذریعہ جو نتائج حاصل کیے ہیں۔ اُن کے مطابق ہم شکل جُڑواں افراد میں حیرت انگیز مشابہت اس لیے پائی جاتی ہے، کیوں کہ اِن افراد کو بہت سی صلاحیتیں خاندان سے ورثے میں ملتی ہیں۔ مثلاً سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، غم و غصّہ کرنے کی عادت، درد کو برداشت کرنے کی طاقت اور لوگوں میں گھُل مِل جانے کا رویّہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

تاہم بعض ماہرین کا خیال ہے کہ انسان جینیاتی اثرات کا غلام نہیں ہے بلکہ اس کا ماحول بھی جس میں اُس کی پرورش ہوتی ہے۔ اُس کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی دلیل یہ ہے کہ انسان میں جُرم کی طرف مائل کرنے والا کوئی جین نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ انسان جُرم کرنے کی طرف اپنے ماحول ہی کی وجہ سے مائل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض تحقیقات کی گئیں جس سے یہ مفروضہ دُرست ثابت ہُوا۔ مثال کے طور پر دو جُڑواں بچیوں کو دو مختلف خاندانوں میں پالا گیا۔ ایک بچّی کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی جس کا موسیقی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن اُس خاندان میں پرورش پانے والی بچّی ذرا بڑی عُمر کو پہنچ کر عُمدہ پیانو بجانے لگی جبکہ دوسری بچّی جس کی پرورش پیانو کی ایک استاد کے یہاں ہوئی وہ کبھی بھی پیانو بجانا نہ سیکھ سکی۔

بہر حال کچھ بھی ہو جُڑواں افراد ایک ایسا دلچسپ معمّہ ضرور ہیں جو اگر حل ہو جائے تو انسانی زندگی میں ناقابلِ یقین تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں۔ ہم اور آپ تو اس معمّے کے حل ہونے کا انتظار ہی کر سکتے ہیں۔

آپ عیدی کیا لیں گے ؟

ادارہ آنکھ مچولی آپ کو عیدی دینا چاہتا ہے۔ مگر آپ عیدی کیا لیں گے ؟

پیسے تو کتنے ؟ تُحفہ تو کیسا ؟

جو ساتھی سب سے بہتر "عیدی" تجویز کرے گا

عیدی اُسے مِل جائے گی ـــــ اپنی رائے فوراً لکھ بھیجیے۔

"عیدی" آنکھ مچولی کی ـــــ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ڈی ۱۱۲، سائٹ کراچی نمبر ۱۶

آؤ مل کر عید منائیں

محمد امان خان دلؔ

خوشیوں کی قندیل جلائیں
آؤ مل کر عید منائیں
سارے بچے گیت سنائیں ناچیں گائیں دھوم مچائیں
ملنے کو ہم سب سے جائیں مانگ کے اُن سے عیدی لائیں
دُودھ سویّاں خُوب اُڑائیں
آؤ! مل کر عید منائیں
شاہد آؤ، حامد آؤ! شیریں، مونا، خالد آؤ!
گڈّو، اسلم، راشد آؤ! تم بھی اختر عابد آؤ!
چڑیا گھر کی سیر کو جائیں
آؤ! مل کر عید منائیں
دیکھو بھالُو والا آیا! ساتھ میں اپنے بھالُو لایا
بھالُو نے کیا رنگ جمایا اُچھلا کُودا ناچا گایا
ہم بھی یوں ہی رنگ جمائیں
آؤ! مل کر عید منائیں
پاک وطن کے پیارے بچّے ننھے راج دُلارے بچّے
سورج چاند ستارے بچّے آج خوشی سے سارے بچّے
اُچھلیں کُودیں ناچیں گائیں
آؤ! مل کر عید منائیں

ندیدی بلّی اور چوکس فوٹوگرافر

بلّی کی حرکات کے ایک ایک
لمحے کو تصویر بند کرلینا
واقعی فوٹوگرافر کا کمال ہے

ماں

یہ کہانی برِّصغیر کی ایک ایسی نامور شخصیّت نے لکھی ہے جنھیں کہانیوں کے حوالے سے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس خوبصورت اور پُر تاثر کہانی میں آپ کو نصف صدی قبل دلّی میں بولی جانے والی اُردو کی چاشنی نظر آئے گی۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ اس کہانی کی مصنّف شخصیّت کا نام بتائیے۔ درُست جواب کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی ہم ایک ساتھی کو خوبصورت انعام بھجوائیں گے

(ادارہ)

ماسٹر حمید دلّی شہر میں بارہ ٹوٹی پر ایک مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ ان کا گھر مٹورشید آباد میں ایک محلّہ پہاڑی ہے وہاں تھا۔ اُن کے باپ بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حمید کی تعلیم پہلے تو محلّے کی مسجد میں ہوئی۔ تھوڑے دن مُلّا جیون کے مکتب میں انہوں نے پڑھا۔ پھر باپ نے تحصیل کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ حمید اُردو مڈل کا امتحان دینے والا تھا کہ بستی میں طاعون کی ایسی وبا پھیلی کہ گھر گھر ماتم تھا اس وبا میں حمید کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ حمید کی ماں کے پاس کفن دفن کے بعد کل ستائیس روپے

بچے۔ حمید مڈل کے امتحان میں پاس ہو گیا۔ اب اُسے انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ حمید نے مڈل کے امتحان کے لیے ساری دنیا کا جغرافیہ یاد کر ڈالا تھا مگر عجیب بات ہے جب اُس نے سوچا کہ کس شہر میں جا کر انگریزی پڑھوں تو بس ایک دلی کا خیال ذہن میں آیا۔ شاید اس لیے کہ بچپن میں کہانیوں میں دلی شہر کا ذکر سُنا تھا یا اس لیے کہ اس محلے کے ایک صاحب دلی میں پولیس میں نوکر تھے اور ہر برس دو برس بعد گھر جایا کرتے تھے۔ حمید نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ دلی کیسا شہر ہے تو انہوں نے کچھ مُسکرا کر بوجھ بجھکڑ کی طرح کہا تھا "میاں لڑکے تم ان چیزوں کو کیا سمجھو، دلی بڑا گٹھا ہوا شہر ہے۔"

خیر تو حمید کے نزدیک دلی ہی ایک شہر تھا جہاں جا کر یہ انگریزی مدرسے میں پڑھ سکتا تھا۔ ماں سے پندرہ روپے لیے اور دلی پہنچا۔ اس گٹھے ہوئے شہر میں گھنٹوں گھومنے کے بعد یہ گلی قاسم جان میں اپنے پڑوسی نصراللہ خان کانسٹیبل کے گھر پہنچا۔ نصراللہ خان نے جو حمید کے باپ کو اچھی طرح جانتے تھے، حمید کی بڑی خاطر کی اور اپنے چھوٹے سے مکان کے دروازے میں اس کے لیے ایک کھٹولا ڈال دیا۔ حمید اب یہیں رہنے لگا۔ ایک مدرسے میں نام بھی لکھ گیا اور تین سال میں یہ دسویں درجے تک پہنچ گیا۔ اس زمانے میں حمید نے اپنی جماعت کے ایک لڑکے کو جو حساب میں کمزور تھا، حساب پڑھانا شروع کر دیا۔ اس لڑکے کا باپ حمید کو سات روپے مہینہ دیا کرتا تھا۔ حمید نے نصراللہ خان سے کہا کہ اب میرے پاس دام ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں بھٹیارے کے ہاں روٹی کھا لیا کروں۔ نصراللہ خان نے کچھ اس طرح کہا کہ "صاحبزادے کچھ بے وقوف ہوئے ہو۔" حمید کی پھر ہمت نہ پڑی کہ کچھ کہے۔

دس مہینے میں حمید نے ستر روپے تو دلی میں کمائے اور جو پندرہ ماں سے لے کر چلا تھا اس میں سے بھی دس باقی تھے۔ ایک دفعہ ماں نے اور دو روپے کا منی آرڈر بھیجا تھا، کل ہوئے بیاسی روپے۔ مدرسے میں سردیوں کی چھٹی تھی۔ نصراللہ خان نے بھی رخصت لی اور وطن کا قصد کیا تو حمید کو ساتھ لیتے گئے۔

اس زمانے میں حمید کی ماں کے پاس بس اپنے شوہر کے وقت کے بارہ روپے تھے اور آنگن والا کٹھل کا پیڑ جو ہر سال پچیس تیس روپے میں بک جاتا تھا۔ مگر جب حمید گھر پہنچا ہے تو ماں نے ایک عزیز کے ہاں اس کی شادی کا سارا بندوبست کر رکھا تھا۔ شادی جیسے تیسے ہو گئی۔ شادی کے ساتویں روز حمید دہلی واپس چلا آیا۔ یہاں آکر امتحان کی تیاری میں لگ گیا۔ مارچ میں امتحان ہوا اور یہ دوسرے درجے میں پاس ہو گیا۔ اب نوکری کی فکر ہوئی۔ بہت دن اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے کے بعد ایک مدرسے میں عیوضی پر کام کرنے کا موقع ملا۔ حمید آدمی تھا محنتی، اس کا صدر مدرس اس کے کام سے بہت خوش ہوا اور اُس نے ایک پکی جگہ دلوا دی۔

حمید کو اب بیس روپے مہینہ ملتے تھے۔ اس نے پھر ہمت کر کے نصراللہ خان سے کہا کہ "چچا، اگر اجازت دیں تو میں الگ کوئی کوٹھری لے لوں"۔ نصراللہ خان نے کہا "اچھا میاں، تمہاری یہی رائے ہے تو لے لو"۔ اور کچھ دیر کے بعد بولے "میں خود تمہیں سستا سا مکان ڈھونڈ دوں گا جس میں زنانہ بھی ہو"۔ حمید خود بھی سوچ رہا تھا کہ اب اپنی بیوی کو مئو سے جا کر لے آئے۔ نصراللہ خان کی بھی رائے معلوم ہوئی تو تین روپے ماہوار کا ایک چھوٹا سا بے آنگن کا گھر ملتے ہی یہ تین دن کی رخصت لے کر گھر گیا اور اپنی بیوی کو ساتھ لے آیا۔ غریب ماں پھر اکیلی رہ گئی۔

بیوی کو دہلی لائے سات برس ہو گئے۔ اس زمانے میں حمید کے ہاں تین لڑکے ہوئے اور ایک لڑکی جس میں سے دو لڑکے مر گئے۔ بیوی بھی بہت بیمار رہی۔ ایک دفعہ خود اُسے بھی لُو لگ گئی تو کوئی تیرہ چودہ دن چارپائی پر پڑا رہا۔ اُدھر مدرسے میں بھی کام بڑھتا گیا۔ تنخواہ اب اس کی تیس روپے تھی۔ اور دس روپے مہینے پر ایک لڑکے کو اُس کے گھر پر بھی پڑھایا کرتا تھا۔ مگر دلی کا خرچ، بال بچوں کا ساتھ غریب حمید کے پاس بچتا بچاتا کچھ نہیں تھا۔ اس لیے ماں کے خط آتے تھے۔ خود بھی اُس کا جی بہت چاہتا تھا مگر گھر جانے کی نوبت نہ آتی۔

ماسٹر حمید کا قاعدہ تھا کہ صبح محلے کی مسجد میں نماز پڑھتی اور اپنے دروازے میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر آدھا پارہ قرآن مجید کا پڑھا پھر اور کوئی کام کیا۔ تقریباً روز جب یہ نماز پڑھ کر لوٹتے تو ایک ستر برس کی بوڑھی سفید بالوں اور جھکی کمر والی دھوبن جنگیا۔ راستے میں اپنی لادی لیے گھاٹ کو جاتی ملتی تھی۔ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ کوئی سات آٹھ دن سے جنگیا نہ ملی۔ کوئی ایسی بات نہ تھی مگر آٹھویں دن جب ماسٹر حمید صبح صبح مدرسے جانے کے لیے نکلے تو کونے والے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے نہ رہا گیا۔ اور انہوں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھ کر ایک لڑکے سے جو سامنے تھا۔ پوچھا "اماں لڑکے، جنگیا دھوبن کا کیا حال ہے"۔ لڑکے نے کہا "جنگیا تو کل رات کو ایک بجے مر گئی۔ اس کی برادری والے کل جمنا پر اُسے پھونک بھی آئے"۔

ماسٹر حمید کا بے چاری جنگیا سے کیا واسطہ! مگر یہ خبر سُن کر اُن کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ راستے بھر سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتے رہے۔ مدرسے پہنچے تو اُداس، اُداس۔ ساتھیوں نے پوچھا بھی کہ "کہیے مزاج کیسا ہے"۔ یہ کہہ کر کہ "کوئی بات نہیں" ٹال دیا۔ گھر آئے تو بھی سُست سُست۔ بیوی نے پوچھا تو اُسے بھی کچھ نہ بتایا مگر تیسرے روز بقر عید کے دن چھٹی ہونے والی تھی۔ حمید نے دو دن کی رخصت کی درخواست اور دی اور عین بقر عید کے دن مئو رشید آباد کا ٹکٹ لے ریل میں سوار ہو گیا۔ عید کے دن ریل میں کٹا۔ نہ نماز نہ قربانی۔ گردن بھر اس سفید سر کا دھیان لگا رہا۔ جس نے برسوں سوتے وقت اس کے بستر پر جھک کر دعائیں دی تھیں۔ اُس گود کا جس میں برسوں اس نے آرام کیا تھا۔

اس چہرے کا جسے دیکھ کر اس کی ساری پریشانیاں دُور ہو جاتی تھیں اور جسے اب کوئی سات برس سے نہ دیکھا تھا۔

حمید کوئی بُرا بیٹا نہ تھا۔ کوئی یہ بھی نہ سمجھے کہ ماں کی محبت اُس کے دل میں نہ تھی یا جوروبچوں میں پڑ کر یہ اپنی ماں کو بھول گیا تھا۔ یہ سال میں تین چار مرتبہ اپنی ماں کو چار چار، پانچ پانچ روپے کا منی آرڈر بھیج دیتا تھا اور یہ رقم اس غریب بال بچوں والے مدرّس کے لیے بہت تھی۔ گھر ماں کو خط لکھتا تھا تو بچوں کے ہاتھ میں قلم دے کر خط پر کچھ نہ کچھ نشان وادی کے لیے کرا دیتا تھا۔ اس کی بیوی نے بھی کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ وہ بھی برابر اپنے ہاتھ سے خط میں سلام لکھتی تھی۔ ماں کا خط بھی تقریباً ہر مہینے آجاتا تھا۔ اس میں بستی کی اِدھر اُدھر کی خبریں ہوتیں اور ہمیشہ یہ سوال کہ بیٹا گھر کب آئے گا۔ ماں یہ خط ایک درزن سے لکھوایا کرتی تھی۔ اس کی لکھائی ایسے کیڑے مکوڑوں کی سی ہوتی کہ خط کا بہت سا حصّہ مشکل سے پڑھا جاتا مگر یہ سوال ہمیشہ بہت صاف صاف کارڈ پر لکھا ہوتا پڑا۔ اس کا جواب ہر بار حمید بھی یہی لکھ دیتا کہ انشاءاللہ اگلے آموں کے موسم میں مگر ہر سال آموں کا موسم گزر جاتا تھا اور ماں کو بیٹے کی شکل دیکھنی نہ نصیب ہوتی تھی۔ حمید چاہتا تھا کہ سارے کُنبے کو ساتھ لے کر جائے پھر اتنے دن سے نوکر تھا، ماں کے لیے اور دوسرے عزیزوں اور پڑوسیوں کے لیے دہلی کے تحفے بھی لے جائے اور ان سب کے لیے کبھی دام نہ ہو پائے۔ سات برس ارادے ہی ارادے میں کٹ گئے۔ مگر جنکیا کی موت کی خبر نے نہ جانے حمید کے دل پر کیا اثر کیا کہ اکیلا چل ہی کھڑا ہوا۔

ہاں تو بقرعید کے دن مغرب سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے ماسٹر حمید مئو رشید آباد پہنچے۔ خوب زور کی بارش ہو رہی تھی۔ ماسٹر صاحب کے پاس بس ایک چھتری تھی کچھ اور سامان تو ساتھ تھا نہیں۔ لگا یوں ہی پیدل سیدھے گھر گئے۔ مئو رشید آباد میں لوگ برسات کے پانی کی نکاسی کو کوئی ضروری چیز نہیں سمجھتے۔ اس لیے بارش میں اکثر راستے بھی پانی سے بھر جاتے ہیں۔ ماسٹر حمید ایک جگہ پھسل کر گرے بھی، کئی جگہ تقریباً گھٹنوں گھٹنوں پانی سے گزرنا پڑا۔ خیر جیسے تیسے یہ اپنے گھر پہنچے۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ انہوں نے زنجیر کھٹکھٹائی کوئی نہ بولا۔ پھر زور سے کھٹکھٹائی کسی نے جواب نہ دیا۔ چھتری نیچے رکھ کر دونوں ہاتھوں سے دروازہ خوب ٹھوکا اور دو ایک دفعہ بے ساختہ زور سے "امّاں، امّاں" بھی ماسٹر حمید کے منہ سے نکل گیا۔ تو ایک کوٹھری کے اندر سے کسی نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا "یہ کون ہے امّاں والا۔ یہاں کسی کی امّاں نہیں رہتی"۔ ماسٹر صاحب بولے "ارے بھائی حمید کی ماں کا گھر یہی تو ہے نا"۔ تو ایک موٹا سا آدمی بس ایک دھوتی باندھے آنکھیں ملتا اور ایک ہاتھ میں چھتری کی جگہ سوپ لیے پانی سے اپنا بچاؤ کرتا دروازے پر آیا۔ یہ عیوض قصائی کا بیٹا لچھو تھا۔ جو بقرعید کے دن کی کلیجی اور دل گُردوں کے کباب کھا کر ہضم کرنے کے

لیے سو رہا تھا۔ اُس نے کوئی چار برس ہوئے حمید کی ماں سے یہ مکان خرید لیا تھا۔ اس نے بس ایک دو مجلوں میں یہ سب روداد حمید سے کہہ دی اور بتایا کہ تمہاری ماں اب وہ نواسی درزن کا جو گھر کونے میں ہے اُس میں رہتی ہے۔

لچھمو نے یہ کہہ کر دروازہ بند کیا اور جا کر پھر اپنی چارپائی پر پڑ رہا۔ ماسٹر حمید کے ایک دو منٹ تک تو قدم ہی نہ اُٹھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے دِل میں تیر مارا اور کام تمام کر دیا۔ "مکان بک گیا اور مجھے خبر تک نہ ہوئی؟ یا اللہ کیا ماں پر اتنی تنگی تھی؟ میں تو سمجھا تھا۔ کچھ ابا نے چھوڑا تھا۔ کچھ میں بھیج دیتا تھا۔ کچھ آمدنی کٹھل کے پیڑ سے ہو جاتی ہوگی اور کام چلتا ہوگا۔ مگر یہ تو اپنی جھونپڑی بھی پرائے ہاتھوں بک گئی۔" یہی سوچتے سوچتے جب سر اُٹھایا تو نواسی درزن کے مکان کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ اُس نے زنجیر ہلانے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھ بھاری پڑ گیا ہے۔ خیر زنجیر کھٹکھٹائی۔ نواسی جو وہیں پاس بیٹھی کچھ سی رہی تھی، دروازے پر آئی اور حمید کو پہچان گئی۔ اُس نے نہ کچھ کہا نہ سُنا۔ چلاتی ہوئی سیدھی اندر گئی کہ "حمید کی ماں، حمید آگیا۔"

حمید کی ماں سے کوئی سال بھر سے اُٹھا بیٹھا بھی مشکل سے جاتا تھا۔ مگر یہ خبر سُن کر نہ جانے کہاں سے طاقت آگئی کہ جھٹ چارپائی سے کُود کر دروازے کو دوڑی، حمید کو لپٹا لیا اور زار زار رونے لگی۔ حمید کی ماں کے بدن میں بس ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں اور نہ جانے آدمی بوڑھا ہوتے ہوتے گھس جاتا ہے۔ یا کیا کہ یہ بالکل بچوں کی طرح زار سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ہاں سر کے بال سفید تھے جیسے براق۔ گردن پر سر کا بوجھ اُٹھانا بھی مشکل تھا اور سفید سر برابر ہلے جاتا تھا۔ نہ جانے کمزوری سے نہ جانے محبت کی زیادتی سے سارے بدن میں رعشہ تھا۔ کئی منٹ تک یہ حال رہا، نہ ماں نے کچھ کہا نہ بیٹے نے آخر اس سکوت کو ماں نے ہی توڑا اور کہا "بیٹا کالے کوسوں سے آیا ہے۔ سعیدہ کی اماں پانی میں شربور، ذرا بیٹھ جا تو جا، بنا لاؤں۔" حمید کی زبان سے اس کے جواب میں یہ نکلا "اماں تم نے گھر بیچ ڈالا۔ مجھے خبر تو کی ہوتی۔" اماں نے کہا۔ "بیٹا خبر کرنے سے کیا فائدہ ہوتا؟ تجھے اور فکریں کیا کم ہیں اور یہ بے چاری نواسی، اللہ بھلا کرے، بہت خیال کرتی ہے مجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں۔ بیٹا تو آگیا۔ میری تو زندگی ہو گئی۔"

حمید نے اب ذرا نظر اُٹھا کر مکان کو دیکھا تو سامنے ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ اس میں نواسی کے دو بچے ایک جھنگلی چارپائی پر پڑے سو رہے تھے۔ ایک الگ کونے میں کھیل رہا تھا اور ایک چلا چلا کر رو رہا تھا۔ نواسی اُسے چُپ کرا کے چولہے میں آگ سُلگانے لگی تو حمید نے دیکھا کہ بے چاری کا کُرتا پیٹھ پر بالکل پھٹا ہُوا تھا۔ کپڑے دُھلے ہوئے صاف ضرور تھے۔ کیوں نہ ہوتے عید کا دن تھا۔ حمید نے

ماں سے پوچھا" اماں کیا تم بھی یہیں سوتی ہو؟"

ماں نے کہا"بیٹا، میں اُدھر کی دوسری کوٹھری میں رہتی ہوں یہاں تو نواسی سوتی ہے جو تمہیں خط لکھا کرتی ہے۔"

"اماں کیا تم اب بھی کچھ کام کرتی ہو۔ اب تو تمہارے ہاتھ تھک جاتے ہوں گے۔"

"نہیں بیٹا" ماں نے کہا" ہاتھ تو ابھی تک کام دیتے ہیں۔ مگر کوئی ڈیڑھ سال سے آنکھیں بے کار ہیں، نگاہ نہیں جمتی۔"

حمید چلّایا" آنکھیں؟ اماں تو کیا تم مجھے بھی نہیں دیکھ سکتیں؟"

ماں نے حمید کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر گالوں پر، اس کے سر کو چھاتی سے لگایا۔ منہ پر کچھ مسکراہٹ سی آئی اور کہا" بیٹا، تجھے تو دیکھ سکتی ہوں اللہ کا شکر ہے۔ سورج نکلتا ہے اُسے بھی دیکھ سکتی ہوں۔ گھر بھی دیکھ سکتی ہوں، مگر اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں بیٹا تیرا سب سے چھوٹا ننھا اب کتنے دنوں کا ہُوا۔۔۔"

"اماں تمہاری دُعا سے ڈیڑھ برس کا ہے۔" اچھا تو وہ کُرتا ٹوپی اُس کے بالکل ٹھیک ہوگا۔" یہ کہہ کر ماں نے ایک میلی سی گٹھری کھولی اور اس میں سے ٹٹول کر ایک بچکا لگا ہُوا ریشمی کُرتا نکالا اور ایک لال خوبصورت گول ٹوپی جس پر سنہری کناری ٹکی ہوئی تھی۔" اماں کیا یہ تم نے ننھے مجید کے لیے سیا ہے۔" حمید نے پوچھا اور آنکھیں ذرا نم ہوگئی تھیں۔ ہاتھ سے اُنہیں پوچھا۔

"نہیں بیٹا" ماں نے کہا" یہ سیے تو تھے میں نے تیری سلمہ کے لیے مگر تم آئے ہی نہیں اور وہ بے چاری چل بسی۔" ساری گفتگو میں شکایت کا بس یہی ایک لفظ تھا۔ اور بس۔ حمید، ماں کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور نہ جانے کن خیالوں میں گم ہوگیا۔ اسی طرح شاید دو گھنٹے گزر گئے۔ اس طرح عرصے میں پڑوس۔ کے کمہار کی بیوی نصیبن بھی گھر میں آگئی تھی اور یہ تینوں عورتیں نہ جانے اِدھر اُدھر کیا کرتی پھرتی تھیں کہ کوئی آٹھ بجے حمید کی ماں نے آکر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا" بیٹا آج تو، تو میرے ساتھ روٹی کھائے گا۔"

حمید جو سو گیا تھا چونک پڑا اور کہا" اماں اور نہیں تو کیا۔" اس کا خیال تھا کہ ماں جب اس غربت کی حالت میں دن کاٹ رہی ہے۔ تو جوار کی روٹی اور کچھ دال دلیا ہوگا۔ مگر وہاں تو ایسے ٹھاٹھ کا دسترخوان چُنا ہوا تھا کہ حمید حیرت میں رہ گیا۔ کباب تھے۔ کلیجی تھی، پراٹھے تھے، انڈوں کے چلّے تھے ماش کی دال تھی مٹو کا تیز تیز سرکا تھا آم کی چٹنی تھی، ایک پیالے میں دودھ تھا۔ ایک طشتری میں بالائی اور ایک رکابی میں کٹے ہوئے قلمی آم۔ حمید حیرت میں تھا کہ اس غربت میں یہ سامان کہاں سے آیا کچھ سمجھا کہ دوڑ دھوپ تو نصیبن اور نواسی نے کی مگر دام آخر کہاں سے آئے۔ یہ سوچتا جاتا اور نوالہ منہ میں دیتا جاتا، مگر مُنہ میں نوالا پہنچ کر

ایسا معلوم ہوتا کہ نوالہ کچھ بڑھ گیا ہے اور منہ چلانے میں دقت ہوتی ہے۔ کھانا ختم ہوا تو حمید کے منہ سے بے ساختہ وہ دُعا نکلی جو بچپن میں ماں نے اُسے سکھائی تھی اور جو اس نے برسوں سے کھانے کے بعد نہ پڑھی تھی۔

کھانا کھا کر حمید پھر ماں کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نصیبن اور نواسی باہر چلی گئیں اور حمید کی ماں نے قریب آکر اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹا، بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں"۔

حمید کا منہ زرد پڑ گیا۔ دِل بیٹھنے سا لگا۔ اُسے خیال ہوا کہ شاید ماں یہ کہے گی کہ مجھے اس پرائے گھر سے نکال کر اپنے ساتھ لے چل یا کوئی دوسرا گھر لے دے۔

یہی خیال دل میں آرہے تھے۔ مگر حمید نے کہا۔ "اماں ضرور کہو"۔

ماں نے کہا "بیٹا تو لشکروں کا رہنے والا ہے۔ مدرسے میں نوکر ہے۔ میں پرائے گھر پڑی ہوں تیری کیا خاطر کروں۔ نصیبن کو بھیج کر خان صاحب کی کوٹھی میں تیرے لیے ایک کمرہ صاف کرایا ہے اور کھاٹ ڈلوادی ہے مگر جی یہی چاہتا ہے کہ تو میرے ساتھ رہتا۔ کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ کیا تو میرا یہ ارمان پورا کر سکتا ہے میں نے اسی امید پر نصیبن کے ہاں سے یہ چارپائی بھی منگالی ہے۔ سامنے چھپر میں ایک چارپائی کھڑی تھی۔ جس کی ادوان غالباً اسی وقت کسی گئی تھی۔

ماں کی یہ بات سُن کر حمید کا جی بھر آیا۔ منہ سے آواز نہ نکلی۔ گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "اماں یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں تمہارے پاس نہ رہوں گا۔ تو کہاں جاؤں گا"۔

ماں نے حمید کی پیشانی پر بوسہ دیا اور جھٹ نصیبن سے وہ چارپائی اپنی کوٹھری میں ڈلوادی۔ پھر ایک گٹھری کھولی۔ اس میں سے ایک سفید چادر نکالی جس پر بڑی خوبصورت بیل لگی تھی۔ دو تکیے نکالے صاف صاف غلاف چاروں طرف جھالر۔ اوڑھنے کے لیے ایک باریک چادر۔ تکیوں پر کوئی اچھا سا عطر ملا ایک نیا گالدان پٹی کے نیچے لا کر رکھا اور بیٹے کی طرف بڑھی اور کہا۔ "بیٹا، اب تم سو رہو۔ بہت تھک گئے ہو گے"۔

حمید یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا اور حیرت میں تھا کہ یا اللہ یہ سب کہاں سے آیا۔ آخر نہ رہا گیا اور اس نے پوچھ ہی لیا کہ "اماں یہ کھانے اور یہ سارا سامان کہاں سے آیا"۔

اماں بولی "بیٹا اب منہ بھی لشکر ہی سا ہے۔ اللہ رکھے سب چیز ملتی ہے اور کھانا، سو آج تو بقر عید کا دن ہے۔ گوشت پڑوسیوں کے گھر سے آیا تھا اور چیزیں بھی اِدھر اُدھر سے کر لیں"۔

"مگر اماں یہ چادر، یہ غلاف، یہ جُوتیاں، یہ سارا سامان، عطر مراد آبادی اگالدان، اس کے لیے

روپیہ کہاں سے آیا؟"

ماں کی اندھی آنکھوں سے پانی کی دو چار بوندیں ٹپکیں اور اس نے ایسی آواز میں جس میں نہ جانے ملامت کا زیادہ اثر تھا یا محبّت کا، کہا "بیٹا تو اور یہ پوچھتا ہے! ایک ایک دن تیرے ہی انتظار میں کٹا ہے۔ سات برس میں تیّاری کر پائی ہوں۔ بیٹا، سات برس میں!"

ماں کی اس بات کو سُن کر خاموشی کے فرشتے نے اس چھوٹی سی کوٹھری میں اپنے پَر پھیلا دیے پھر رات بھر کسی نے کسی سے کچھ بات نہ کی۔

حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا
مقبول ترین سلسلہ تحریر
اخلاق احمد کی مہمّاتی کہانیوں کا

دلچسپ مجموعہ

برائیوں سے برسرِ پیکار
۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے
حسین سرورق - اعلیٰ طباعت
حق اسکواڈ کے حصول کے لیے
دس روپے کے
ڈاک ٹکٹ ارسال کیجیے،

ڈاک ٹکٹ ارسال کرنے کے لیے ہمارا پتہ

گرین گائیڈ اکیڈمی

ڈی، ۱۱۲ نورس روڈ، سائٹ، کراچی

دنیا میرے آگے

دلچسپ خبریں ــــ حیرت انگیز اطلاعات

دعوۃِ اکیڈمی کا اعلان بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے شعبہ، دعوۃ اکیڈمی نے ربیع الاوّل کے حوالے سے انعامی مقابلے کے نتائج کا اعلان کر دیا ہے۔ جس کے مطابق کراچی کی صفیہ سلطانہ صدیقی کو اوّل، شجاع آباد، ملتان کی شہناز سیال کو دوم اور کراچی ہی کی نیّر جبیں کو سوم انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دس خصوصی انعامات جن افراد کو دیئے گئے ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔

حامد علی شاہد۔ لاوہ (چکوال)، رخسانہ ریاض، کراچی عامر یونس، کراچی۔ سعیدہ ارشاد پھالیہ، گجرات، محمد فاروق دانش، حیدر آباد۔ سیّد کاشان جعفری۔ کراچی۔ محمد عمر احمد خاں، کراچی۔ ماریہ عرفان۔ واہ کینٹ نذر حسین تالپور، خیر پور میرس۔ شازیہ نور، لاہور۔

انعامی مقابلے کے تمام شرکار کو دعوۃِ اکیڈمی کی جانب سے سرٹیفکیٹ بھی روانہ کیے گئے ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ انعام یافتگان کی نصف کے قریب تعداد آنکھ مچولی کے قلمی معاونین کی ہے۔

قُربانی کے یہودی کُتّے اسرائیلیوں نے اپنی فوج میں "قربانی" کے مقاصد کے لیے بہت سے کتّے پالے ہوئے ہیں۔ جی ہاں! ہُوا یہ کہ بیروت میں فلسطینی حرّیت پسندوں کی جدوجہدِ آزادی کو کچلنے کے لیے یہودیوں نے ایک منصوبہ بنایا۔ منصوبے کے مطابق کتوں کو ٹریننگ

دی گئی۔ اس کے بعد جنوب مشرقی بیروت میں فلسطینیوں کے خفیہ سرنگ میں ان کتوں کو داخل کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے "قربانی" کے ان کتوں کے گلے میں بندھے ہوئے دھماکہ خیز مادے کے ساتھ ان کو سرنگ کے پاس چھوڑ دیا جاتا۔ اور یہ یہودی کتے تھوڑی دیر بعد سرنگ میں داخل ہو جاتے۔ اس کے چند لمحوں بعد ریموٹ کنٹرول کے ذریعے دھماکہ خیز مادہ اُڑا دیا جاتا۔ لیکن فلسطینی حریت پسند بھی اس سازش سے باخبر ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے قربانی کے تین یہودی کتوں کو سرنگ کے داخلی حصے سے ۷۰۰ میٹر دُور گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جبکہ چوتھا کتا سرنگ سے ۵۰۰ میٹر دُور مار دیا گیا۔ اس طرح ان یہودی کتوں کی "قربانی" رائیگاں چلی گئی۔

چائے چاہیئے

چائے تو ہم سب ہی پیتے ہیں۔ آج ہم آپ کو اس کے بارے میں کچھ دلچسپ حقائق سے آگاہ کر رہے ہیں۔ چائے کا سب سے اہم عنصر کیفین ہے، چائے میں اس کی مقدار چار یا پانچ فی صد ہوتی ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ چائے کی ایک پیالی میں چار سے پانچ کیلوری ہوتی ہے۔ اگر آپ اس میں دُودھ شامل کریں تو دس کیلوری کا اضافہ ہو گیا ہے اگر آپ شکر بھی ملائیں گے۔ تو ۲۵ کیلوری مزید شامل ہو جائے گی۔ گویا ایک پیالی چائے میں چالیس کیلوری شامل ہوتی ہے۔ جدید تحقیق سے ایک بات اور سامنے آئی ہے۔ وہ یہ کہ چائے میں وٹامن بی کمپلیکس کے اجزا بھی موجود ہوتے ہیں۔

ماحول پر آلودگی کے اثرات

سائنس دانوں نے کرۂ ارض پر سمندروں اور ماحول پر آلودگی کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ایک تحقیق شروع کی ہے۔ جس کا مقصد آلودگی کی وجہ سے دنیا کے موسم پر واقع ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینا ہے۔ یہ تحقیق چار سالوں پر محیط ہوگی۔ اور یہ لارنس لیور مور نیشنل لیبارٹری اور اسکرپس انسٹی ٹیوشن آف اوشیانو گرافی، کیلی فورنیا میں ہوگی۔ اعداد و شمار اور مختلف معلومات کے حصول کے لیے سیٹلائیٹ اور سُبک رفتار سُپر کمپیوٹر سے بھی مدد لی جائے گی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس تحقیق پر آٹھ لاکھ ڈالر خرچ ہوں گے۔

Magic face Magic face Magic face Magic face Magic face Magic face Magic face Magic face Magic f

اگر آپ دوسروں کے پیچھے چلیں گے تو یہی ہوگا جو اس کہانی میں ہوا۔

اپنی چال

عامر یوسف

"اُف ... امّی کندھے میں بہت درد ہو رہا ہے ..." تنویر گھر میں داخل ہوتے ہی چلّایا۔

"مگر کیوں ..." اُس کی امّی نے پوچھا۔

"وہ میں نے آج بولنگ کرائی تھی ... اس لیے ..." تنویر نے کہا۔

"بولنگ کرائی تھی ... مگر تم کرکٹ کہاں کھیلتے ہو ..." اس کی امّی نے حیرانی سے پوچھا ...

"ارے امّی جی ... ورلڈ کپ کے دوران سب ہی کرکٹ کھیلتے ہیں۔"

"مگر وہ سب پہلے بھی کھیلتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کے کندھے میں درد نہیں ہوتا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تمہیں، اور بولنگ کرانے چلے ہیں ..."

اور امّی دوبارہ کام میں مصروف ہوگئیں، تنویر نے ایک آہ بھری ... بام کی شیشی اُٹھائی اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

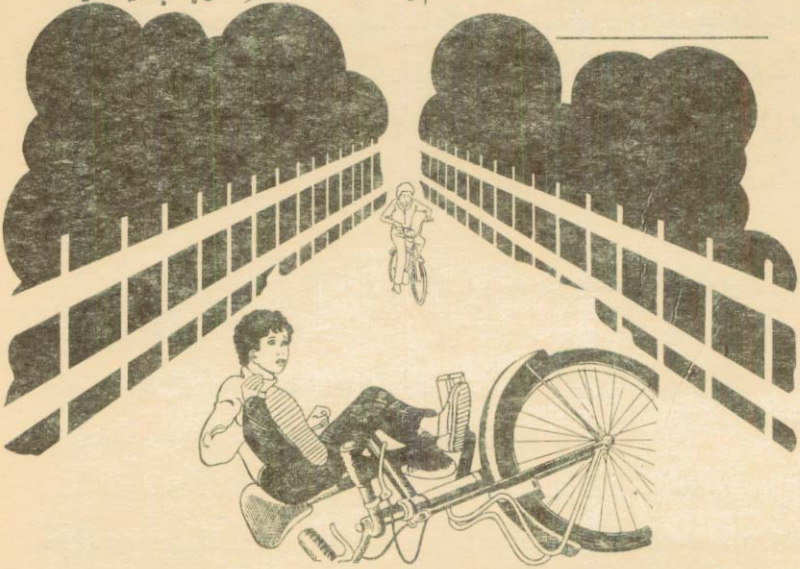

"اوئے بس کرو یار... یہ اوور ختم... پانچ گیندیں کرائیں... پانچوں کی پانچوں وائیڈ... کوئی تو سیدھی پھینک دو۔" شعیب نے کہا اور تنویر تلملا کر رہ گیا۔ وہ اتنی کوشش کر رہا تھا مگر یہ شعیب اور دوسرے سب لڑکے تو بس مذاق اُڑانا جانتے ہیں۔ کندھا پھوڑے کی مانند دُکھ رہا تھا۔

اور جب تنویر نے چھٹی گیند کرانے کی کوشش کی تو غضب ہی ہو گیا... بال پھینکتے ہی اُس کے کندھے کا پٹھا چڑھ گیا تھا اور بال سامنے جانے کے بجائے سائیڈ میں جاتے ہوئے صدیقی صاحب کے عین منہ پر جا لگی۔ تنویر تو اپنا کندھا پکڑ کر دوہرا ہو گیا تھا۔ اس کو پتا نہ چل سکا اور تمام بچے بھاگ گئے۔

"نالائق... بدتمیز... بدمعاش... ہمارے چہرے پر ہی گیند مار دی... ارے میں تو جھوڑوں گا نہیں" صدیقی صاحب کی چھڑی کی چوٹیں کھا کر تنویر اپنا کندھا وغیرہ سب بھول گیا اور دوڑ لگا گیا۔

بستر میں پڑا ہوا تنویر رو رہا تھا۔ کندھے کی تکلیف اور صدیقی صاحب کی مار پیٹ سے اُس کو بخار چڑھ گیا تھا۔ قریب ہی بیٹھی امّی اس کو دلاسا دے رہی تھیں۔

"میں... میں کیا کروں... باؤلنگ کرائی نہیں جاتی... بیٹنگ کرتا ہوں تو ڈر لگتا ہے... فوراً بولڈ ہو جاتا ہوں۔ ہاکی میں کھیل نہیں سکتا... بھاگا ہی نہیں جاتا... فٹ بال تو دور کی بات ہے..." اور اپنی مجبوری پر تنویر پھر رونے لگا۔

"نہیں تنویر بیٹے بات یہ نہیں۔ تم کھیل سکتے ہو۔ ذرا کوشش کیا کرو۔ تھوڑی سی محنت چاہیئے ہوتی ہے۔"

"کوشش... باؤلنگ سیکھنے کی کوشش میں کندھا اُتر گیا... بیٹنگ کی کوشش کر رہا تھا کہ چشمہ ٹوٹ گیا۔ ہاکی میں گھٹنا چھل گیا... اتنی تو کوشش کرتا ہوں۔ مگر پھر بھی کھیل ہی نہیں پاتا۔ آپ تو کہتی ہیں انسان کو کوشش اور محنت کرتی چاہیے۔ باقی اللہ مدد کرتا ہے۔ مگر یہاں تو کوشش اور محنت کر کر کے جسم پورا چھل گیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ تو مدد کر ہی نہیں رہا۔"

تنویر کا لہجہ شکایت سے بھرپور تھا۔ امّی بھی جانتی تھیں کہ یہ مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ تنویر سے اس وقت اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے۔

"اچھا بیٹے۔ میں تمھارے لیے سوپ لے کر آتی ہوں۔ یہ کہہ کر امی تو چلی گئیں مگر تنویر کا منہ بن گیا۔

"سوپ... اوغ..." ابھی سے اُس کو ابکائیاں آنے لگی تھیں۔

"لے تنویر ذرا سائیڈ میں ہو جانا..." کسی نے پیچھے سے چلّا کر کہا۔ اور تنویر نے اپنا چشمہ سنبھالا اور سائیڈ میں ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا آصف اپنی بی ایم ایکس BMX سائیکل پر آ رہا تھا۔ تنویر کے قریب پہنچ کر آصف نے زور لگا کر سائیکل

کا اگلا پہیہ زمین سے اوپر اُٹھا لیا اور پھر صرف ایک پچھلے پہیے پر ہی وہ وہیلی WHEELIE لگاتا دُور تک چلا گیا۔

"واہ... زبردست...!" تنویر کو بہت اچھا لگا۔

"میں بھی ایک پہیے پر سائیکل چلاؤں گا۔"

دوسرے دن ہی تنویر صاحب نے ابّا سے بی ایم ایکس BMX کی فرمائش کر دی اور ابا کو سائیکل لاکر دینا ہی پڑی تنویر صاحب فوراً سائیکل پر بیٹھے اور سائیکل چلاتے ہوئے باہر گلی میں آگئے۔ سامنے وہی لڑکا آصف اپنی بی ایم ایکس پر جا رہا تھا۔ تنویر نے آواز لگا کر قریب بلا لیا۔

"یار... مجھے بھی بتاؤ ایک پہیے پر سائیکل کس طرح چلاتے ہیں؟"

تنویر نے پوچھا۔ آصف نے بغور اوپر سے نیچے تنویر کا جائزہ لیا پھر ہنسنے لگا۔

"تو... تو تم نے وہیلی WHEELIE لگانے کے لیے یہ بی ایم ایکس BMX خریدی ہے... ہا ہا ہا...!"

"مذاق کی بات نہیں۔ میں بھی وہیلی لگاؤں گا۔ تم مجھے بتاؤ تو سہی۔" اور آصف کو بتانا ہی پڑا۔

"جب سائیکل چلنے لگے تو اچانک اگلا پہیا زور لگا کر اُوپر اٹھاؤ اور پیڈل مارتے جاؤ۔" یہ ہدایات آصف نے دی تھیں اور تنویر صاحب نے فوراً مشق شروع کر دی۔

سائیکل چلا کر انھوں نے اچانک زور لگا کر اگلا پہیا اُوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر یہ کیا۔ یہ تو اتنا بھاری تھا۔ خیر... تنویر صاحب نے دوبارہ کوشش کی اور ایک دفعہ پھر جان لگائی۔ مگر اس دفعہ کچھ زیادہ زور لگا دیا تھا کیونکہ اگلا ہی نہیں پچھلا پہیہ بھی ہوا میں بلند ہو گیا تھا اور تنویر صاحب پیٹھ کے بل زمین پر چاروں شانے چت۔

ایک دفعہ پھر تنویر صاحب بستر پر دراز تھے۔ اس دفعہ ابّا سرہانے موجود تھے۔

"کیوں کر رہے تھے یہ فضول حرکت؟" ابّا نے پوچھا۔

"میں... میں وہیلی لگا رہا تھا۔"

"پہلے کبھی لگائی تھی جو اب لگا رہے تھے؟"

"مگر کوشش کر رہا تھا۔"

"ارے کوشش کسی اور کھیل میں کر لیتے..." اور تنویر صاحب اس دردناک مسئلہ کے چھڑتے ہی رونا شروع کر چکے تھے۔

"ہر کھیل میں کوشش کر چکا ہوں۔ کہیں بھی اللہ مدد نہیں کرتا۔" اور بے بسی پر دوبارہ زور شور سے رونے لگے۔

ابّا سمجھ گئے کہ معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے ذرا ٹھیک طرح سمجھانا پڑے گا۔

"اچھا تنویر بیٹا ذرا وہ محاورے تو بتاؤ۔ جو تم نہایت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔"

"کون سے؟" "وہی کوّے اور ہنس کی چال والے وغیرہ وغیرہ۔"

"کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔ اور جس کا کام اسی کو ساجھے" تنویر صاحب نے فوراً دو محاورے داغ دیے۔

"ہاں اب بتاؤ۔ ان کا مطلب کیا ہے؟" ابّا نے پوچھا۔

"ان کا مطلب ہے کہ جو کوئی ایک کام کر سکتا ہو ضروری نہیں کہ وہ دوسرا کام بھی کر سکتا ہو۔"

"بالکل... دیکھو تنویر بیٹے ... ہر انسان میں اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں بخشی ہیں۔ مگر یہ انسان کی اپنی اپنی مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ کوئی کرکٹ اچھی کھیلتا ہے۔ کوئی سائیکل اچھی چلاتا ہے۔ کوئی پڑھائی میں بہت اچھا ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ جو کرکٹ اچھی کھیلے وہ ہاکی بھی اچھی کھیلے یا جو سائیکل اچھی چلائے وہ اچھا پڑھنے والا ہو۔ اور اگر کوئی اس طرح کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہی بات ہوتی ہے۔ "کوا چلا اپنی چال" "اپنی نہیں ہنس کی" تنویر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوہ معاف کرنا ہاں تو کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔"

"تو جو دوسری چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہے وہ اپنی صلاحیت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ بیٹے! اللہ نے تم میں پڑھنے، تقریر کرنے اور لکھنے لکھانے کی صلاحیت دی ہے۔ یاد ہے نا۔ تم نے کتنے انعامات جیتے ہیں۔ کبھی اوّل آنے پر کبھی تقریری مقابلہ یا کہانی نویسی کا مقابلہ جیتنے پر۔"

"جی ہاں۔" تنویر کی سمجھ میں آ رہا تھا، آنسو بھی تھم چکے تھے۔

"تو بس۔ بیٹے جو صلاحیت تم میں ہے اسی کو پروان چڑھاؤ۔ دوسری چیزوں کے پیچھے نہ بھاگو..."

ابّا جی کہہ رہے تھے اور تنویر کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"ہاں۔ میں اپنی چال بھول کر دوسری چال چلنے لگا تھا۔ مگر اب نہیں، اب میں اپنی چال ہی چلوں گا۔ اور سب سے اچھے طور سے چلوں گا۔ انشاءاللہ" تنویر کے لہجے میں عزم تھا، ولولہ تھا۔

"انشاءاللہ" اس کے ابّا نے بھی اس کے ساتھ کہا...

سفرِ مبارک

معلومات بھی ـــــ رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کر سکتے ہیں

لاوارث بچّہ

سیّد خورشید عالم

ایک سچّی کہانی جس کے کردار زندہ ہیں

گیارہ سالہ بیک سنگ کو امریکی فوج کے ایک یونٹ نے شدید بھوک پیاس کے عالم میں ایک جگہ پڑے ہوئے پایا۔ چنانچہ یونٹ کے ایک نوجوان سپاہی بلّی نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ اس بچّے کو یونٹ کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے رکھ لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ مئی ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے۔ کوریا میں جنگ کو ایک سال ہونے کو آیا تھا اور بیک کی طرح بہت سے بچے یتیم اور بے سہارا ہو گئے تھے۔ اس یونٹ میں بیک کو کھانے کے لیے عمدہ کھانا ملتا تھا۔ بلّی نے اس کے لیے دو جوڑے بھی سلوا دیے تھے۔ اب سارا دن بیک یونٹ کے چھوٹے

موٹے کام کرتا رہتا۔ بہت سے سپاہیوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اب وہ انگریزی بھی بولنے لگا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی موت کا غم بھی کافی حد تک بھول چکا تھا۔ پورے یونٹ میں وہ اگر سب سے زیادہ کسی سے مانوس تھا تو وہ بلّی ہی تھا۔ بیس سالہ یہ نوجوان عام سپاہیوں کے برعکس خاموش اور ٹھنڈے مزاج کا تھا۔ وہ ہر طرح بیک کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا اسی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے اور قریب آتے گئے۔ ایک بار بیک بیمار پڑ گیا تو بلّی نے ساری رات جاگ کر اس کی تیمار داری کی۔ اسے وقفے وقفے سے دوا پلاتا رہا۔ اسی طرح ایک بار بلّی کو دوسرے یونٹ میں اسلحے کی کھیپ پہنچا کر آنے میں بہت دیر ہو گئی تو بیک آدھی رات تک اس کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ واپس آیا تو بیک بلّی سے لپٹ کر رونے لگا۔ کہنے کو ایک امریکی اور دوسرا کورین تھا مگر وہ اس طرح رہتے تھے جیسے ایک گھر میں سگے بھائی رہتے ہیں۔

ایک بار امریکی ہیڈ کوارٹر سے پیغام موصول ہوا کہ تمام امریکی یونٹوں میں پندرہ سال سے کم عمر کورین لڑکوں کو سیئول میں واقع یتیم خانے بھیج دیا جائے۔ بیک بلّی کو چھوڑ کر جانے پر کسی طرح تیار نہ تھا۔ اس نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر یونٹ کے کمانڈنگ افسر نے اُسے خصوصی طور پر رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ سُنتے ہی بیک نے پہلی مرتبہ بالکل فوجیوں کے انداز میں اکڑ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کو سیلوٹ کیا۔ کمانڈنگ افسر ہنستے ہوئے اس کے سیلوٹ کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

کرسمس کا تہوار قریب آتا جا رہا تھا۔ کرسمس سے دو دن قبل بلّی نے اُسے ایک بڑا سا پارسل لا کر دیا۔ بیک نے پارسل کو کھولا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں اس کے لیے جیکٹ، قمیض، جوتے اور عام استعمال کی بہت سی چیزیں تھیں۔

"یہ اتنی ساری چیزیں مجھے کون بھیج سکتا ہے؟" بیک نے بڑی حیرانی سے بلّی سے سوال کیا۔

"میں نے نیویارک میں اپنی بہن کو تمہارے بارے میں لکھا تھا کہ مجھے یہاں ایک پیارا سا بھائی مل گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے کرسمس کے موقعے پر تمہارے لیے بھی کچھ چیزیں بھیج دیں۔" بلّی نے اطمینان سے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اب آپ ان کو خط لکھیں تو میری طرف سے سلام اور ان تحائف کے لیے میرا شکریہ بھی لکھ دیجیے گا۔" بیک نے کہا۔

دن گزرتے رہے۔ بیک کو اس یونٹ میں رہتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جون ۱۹۵۳ء کی ایک دوپہر ایک گولہ عین اُسی یونٹ کے اندر آکر گرا۔ جس سے گیسولین کے ڈرم میں آگ لگ گئی۔ آگ بہت تیزی سے پھیلی۔ ایسا لگتا تھا جیسے شعلے ہوا میں تیزی سے اُڑتے ہوئے اِدھر اُدھر آجا رہے ہوں۔ بیک کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ وہ گھبراہٹ اور تکلیف سے رونے لگا۔ اچانک کوئی اس پر جھپٹا اور اُسے نیچے گرا کر اس پر ایک کمبل ڈال دیا۔ اس کے بعد بیک کو کچھ یاد نہیں کہ کیا ہُوا۔ بیک کے پیٹ سینے اور ٹانگوں پر آگ کی وجہ سے بڑے بڑے آبلے پڑ چکے تھے اٹھارہ گھنٹے بعد بیک کو ہوش آیا تو اُس نے بلّی کی مہربان صورت کو اپنے نزدیک پایا۔

"مت گھبراؤ۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ڈاکٹر بڑی توجہ سے تمہارا علاج کر رہے ہیں" بلّی نے اس کو تسلی دی۔ آرمی کے اسپتال میں اس کا بڑی توجہ سے علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹروں نے اس کی تکلیف کے پیشِ نظر اسے ایسی ادویات استعمال کرائیں جس سے اس کا زیادہ وقت سو کر گزرتا تھا۔ تاہم جب بھی اس کی آنکھ کھلتی وہ دیکھتا کہ بلّی کبھی اس پر جُھکا اس کا کمبل ٹھیک کر رہا ہے تو کبھی اس کے پاس خاموش بیٹھا اُسے دیکھ رہا ہے۔

۲۷ جولائی ۱۹۵۳ء کو جنگ ختم ہو گئی۔ اس دن بلّی اسپتال آیا تو اس نے وردی نہیں پہن رکھی تھی۔ بلکہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے بیک کی خیریت دریافت کی، پھر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس جا کر کچھ پوچھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آکر بیک کے پاس بیٹھ گیا۔ بیک کو لگا جیسے بلّی اس کو کچھ بتانا چاہ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھا اور بیک کو گلے لگا کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ اس کے بعد اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر تیز تیز قدموں سے وہ باہر چلا گیا۔ اس کے کئی روز بعد تک بیک بلّی کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آیا۔ بیک نے ڈاکٹر سے اپنے یونٹ کے بارے میں دریافت کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ یونٹ امریکہ واپس چلا گیا۔ بیک یہ سن کر رو پڑا۔

"اچھا تو تم اس دن اپنی واپسی کا مجھے بتانا چاہ رہے تھے مگر نہیں بتایا۔ بلّی... تم کہاں چلے گئے؟ میں تمہیں کہاں تلاش کروں؟" وہ روتا رہا اور آنسو کے قطرے اس کے تکیے میں جذب ہوتے رہے۔

دو ماہ بعد اُسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ اسپتال کے ایک مہربان آدمی نے اُسے سیئول میں ایک فیکٹری میں ملازمت دلوا دی۔ اس فیکٹری میں بہت سے بچے بھی کام کرتے تھے۔ بیک یہاں بارہ اور کبھی اٹھارہ گھنٹے تک کام کرتا تھا۔ اس نے یہاں کام کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع

کر دیا۔۔۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے۔ کئی موسم آئے اور گزر گئے۔ بیک نے گریجویشن کر لیا۔ اسی دوران اس فیکٹری کے مالک نے اس کے کام اور شرافت سے متاثر ہو کر اسے فیکٹری کے دو شعبوں کا مینجر مقرر کر دیا۔ بیک نے اپنے کام پر مزید محنت اور توجہ سے اپنے مالک کا دل جیت لیا۔

انیس سال کی عمر میں اس نے اپنا ہیٹ بنانے کا کاروبار شروع کیا۔ ایک سال بعد اس کا کاروبار تیزی سے چل نکلا۔ آج بیک جنوبی کوریا کے بڑے صنعتکاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے ہیٹ بنانے کے کارخانے میں ۲۸۰۰ افراد ملازم ہیں۔ صرف ۱۹۸۵ء میں اسے ۳۲ ملین ڈالر کا فائدہ ہوا۔

۱۹۸۳ء میں بیک نے پچاس ایکڑ زمین خرید کر ایک بڑا ہوسٹل تعمیر کروایا۔ جہاں بے سہارا بچوں کی رہائش اور تعلیم کا معقول بندوبست تھا۔ اس منصوبے پر اس نے ۴۵ لاکھ ڈالر خرچ کیے۔ اس ادارے میں بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف ہنر بھی سکھائے جاتے ہیں۔ بچوں کو معقول وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ کوئی یتیم بچہ میری طرح غربت کے دن نہ گزارے۔ وہ بھوک سے بے قرار نہ ہو۔ اس کے تن پر ڈھنگ کے کپڑے ہوں۔" اس نے ایک انٹرویو میں کہا۔

چند برس قبل اس نے کوسٹاریکا امریکہ میں بھی ایک فیکٹری قائم کی۔ جہاں ۲۰۰ افراد کو روزگار میسر ہوا۔

اتنی مصروفیات اور اپنی بیوی اور بچوں کی محبت کے باوجود وہ بلی کو نہیں بھولا۔ اس نے اس کی تلاش جاری رکھی۔

"بلی۔۔۔ میرے بھائی تم کہاں ہو؟ میرے پاس سب کچھ ہے مگر مجھے پھر بھی تمہاری ضرورت ہے۔" وہ اکثر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا۔ تیس برس گزر جانے کے باوجود بلی کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ بیک نے اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا کر بھی اسے تلاش کرنا چاہا۔ مگر اسے ناکامی ہوئی اس کی بیوی نے ایک بار اسے سمجھانا چاہا کہ ہو سکتا ہے بلی کا انتقال ہو گیا ہو۔ مگر بیک نے اسے منع کیا کہ وہ ایسی باتیں نہ کرے۔

"میرا دل کہتا ہے کہ بلی زندہ ہے۔ وہ امریکہ کے کسی دور دراز قصبے میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوگا۔ اپنے پوتوں اور پوتیوں کے ساتھ۔ میں ایک نہ ایک دن اسے ضرور ڈھونڈ لوں گا۔"

گاؤں کا راستہ

شبّیر بیگ ناز

یہ جو کچّا سا ہے گاؤں کا راستہ
اس سے رہتا ہے میرا سدا واسطہ
گاؤں سے شہر کو جب بھی جاتا ہوں میں
اس کو چلنے پہ تیار پاتا ہوں میں

گاؤں سے کھیت اور کھیت سے نہر تک
چلتا رہتا ہے سب کو لیے بے دھڑک
گاؤں پہ جب گھنے ابر جُھک جاتے ہیں
اور بارش دھواں دھار برساتے ہیں

تب بھی چلتا ہے یہ چُھپ چھپاتا ہُوا
تیز پُروائی میں سرسراتا ہُوا!
اس سے ریوڑ بھی گزریں ہیں دہقان بھی
گاؤں کے لوگ بھی اور مہمان بھی

دوست گزریں تو ہیں اس کی باہیں کھُلی
کوئی دشمن ہو تو بھی ہیں راہیں کھُلی
چور ہو یا کوئی اس پہ ڈاکو چلے
سب کو کرتا ہے رخصت لگا کر گلے

مت تعصّب بھری راہ پہ جاؤ تم
ناز رستے سا کردار اپناؤ تم

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

مسجد

عبدالودود شاہ

وہ ایک کھلا میدان تھا جہاں چند بچے کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک بچہ ایسا بھی تھا جس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی عام سا بچہ نہیں ہے۔ اس کے انداز میں ایک غیر معمولی پن ضرور جھلکتا تھا۔ وہ سب کے ساتھ تھا اور سب سے الگ سا بھی لگتا تھا۔

تبھی میدان سے ایک ضعیف شخص کا گزر ہوا۔ وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہا تھا۔ جب وہ ان بچوں کے نزدیک سے گزرا تو اس کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس کی نظریں اس بچے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بچے کو اپنے پاس بلایا۔ سب بچے کھیل چھوڑ کر اس بزرگ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ بزرگ نے اس بچے سے اس کا نام پوچھا۔ بچے نے اپنا نام بتا دیا۔

بزرگ نے کہا "بیٹے! انشاءاللہ ایک دن آئے گا۔ جب تم اس مملکت کے حکمران بنو گے۔ میری خواہش ہے کہ جب تم حکمران بن جاؤ تو یہاں اس میدان میں ایک مسجد ضرور بنوا دینا۔"

بچے نے وعدہ کرلیا۔ اور وہ خدا رسیدہ بزرگ چلتے چلتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میدان میں کھڑے بچے حیرت سے اپنے اس ہم جولی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا ساتھی کل اس مملکت کا سربراہ بننے والا ہے!!

مسجد بے حد شاندار اور حسین تھی۔

آج مسجد کا افتتاح تھا۔ دُور دور سے بڑے بڑے عُلماء اور مشائخ اس مُبارک اور مقدس تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ فوج کے سردار اور مختلف علاقوں کے حاکم بھی حاضر تھے۔ اس مُبارک تقریب کے آغاز کی تیاریاں ہر طرح مکمل تھیں اور نماز کا وقت ہُوا چاہتا تھا۔

ایک طرف بادشاہ سلامت بھی جلوہ افروز تھے اور سب بے چینی سے منتظر تھے کہ بادشاہ سلامت امامت کے لیے کسی کے نام کا اعلان کریں۔ وہاں موجود تمام علماء و مشائخ میں ہر ایک یہ سعادت حاصل کرنے کا دل سے متمنّی تھا۔ بادشاہ سلامت نے اعلان کیا۔ نماز کی امامت وہ کرائے جس نے کبھی کوئی نماز قضا نہ کی ہو۔

اس اعلان پر ہر طرف سنّاٹا چھا گیا۔ وہاں بڑے بڑے بزرگ موجود تھے، لیکن اُن میں ایسا کوئی نہ تھا، جس سے کبھی نہ کبھی کسی مجبوری یا ضرورت کی وجہ سے کوئی نماز قضا نہ ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کوئی امامت کے لیے آگے کیسے بڑھتا؟ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے اور سب جاننا چاہتے تھے کہ وہ خوش نصیب کون ہے جس کو یہ اعزاز حاصل ہوگا؟

کافی دیر گزر گئی اور نماز کا وقت سر پہ آگیا۔ لیکن کوئی امامت کے لیے آگے نہ بڑھ سکا۔

تب۔ بادشاہ سلامت اپنی جگہ سے اُٹھے۔ الحمدللہ کہہ کر نماز کی امامت شروع کر دی۔

یہ بادشاہ تھے۔ شیرِ میسُور فتح علی ٹیپو سلطان شہیدؒ۔

ٹیپو سلطان شہیدؒ ۲۰ ذی الحج ۱۱۶۳ھ مطابق ۲۰ نومبر ۱۷۵۰ء کو دیوان ہلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حیدر علی اور والدہ کا فخر النساء تھا، سلطان شہید کا نام ان کے والد نے ایک بزرگ ٹیپو مستان ولیؒ کے نام پر رکھا تھا، کہا جاتا ہے کہ آپ کا اصل نام فتح علی تھا۔ لیکن اس کے بارے میں کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ آپ کا اصل نام فتح علی یا ابوالفتح تھا۔ البتہ آپ کے ایک صاحبزادے کا نام فتح حیدر ضرور تھا۔ ۱۷۶۷ء میں نظام دکن نے ٹیپو کو "فتح علی خان بہادر" کا خطاب دیا تھا۔ شاید اسی لیے ان کے نام کے ساتھ یہ نام استعمال ہوتا ہے۔ دربارِ دکن ہی سے ٹیپو سلطان کو "نصیب الدولہ" کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔

سلطان شہیدؒ بچپن ہی سے غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ آپ نے کم عمری ہی میں ہر قسم

کے سپاہیانہ فنون میں زبردست مہارت حاصل کر لی تھی۔ علومِ اسلامی کی تعلیم و تربیت آپ کے والدِ محترم سلطان حیدر علی نے خاص توجہ سے کی۔ ٹیپو سلطان شہیدؒ کو اُردو کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، تامل اور کنڑی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ غالباً برِّصغیر میں کوئی اور حکمراں ایسا نہیں گزرا جو اتنی زبانوں کا ماہر ہو۔

۱۷۶۵ء میں سلطان ٹیپو پہلی بار میدانِ جنگ میں نمودار ہوئے۔ جس میں وہ اپنے والد حیدر علی کے ساتھ مالابار پر حملہ آور ہوئے۔ یہاں انھوں نے صرف تین ہزار سر فروشوں کے ساتھ دشمن کے ایک بڑے لشکر کو مار بھگایا۔ اس پر ان کے والد حیدر علی نے انھیں اپنے باڈی گارڈ دستے میں شامل کر لیا۔ اور جاگیر بھی عطا کی۔ ۱۷۸۰ء تک ٹیپو سلطان نے مختلف معرکوں میں اپنے والد کا بھرپور ساتھ دیا۔ ۱۷۸۰ء ہی میں والد کے حکم پر ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو بُری طرح شکست دی۔ ۱۷۸۲ء تک اس قسم کے معرکوں کا سلسلہ باپ بیٹے نے مل کر جاری رکھا۔ ۷ دسمبر ۱۷۸۲ء کو سلطان حیدر علی انتقال کر گئے۔ مرتے دم تک وہ مسلسل جہاد میں مصروف رہے تھے۔ ۱۱ دسمبر کو ٹیپو سلطان کو یہ اطلاع ملی تو وہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ اِدھر سرداروں نے حیدر علی کی میت کو غسل دے کر تابوت میں رکھ دیا اور چھوٹے شہزادے عبدالکریم کو عارضی طور پر مسند نشین کر دیا۔ ۲۵ دسمبر کو سلطان ٹیپو چکور پہنچ گئے۔ جہاں ان کا لشکر خیمہ زن تھا۔ اگلے روز ۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء مطابق ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ کو بہت سادگی سے تخت نشینی کی رسم ادا کر دی گئی۔ تخت نشینی کے وقت سلطان ٹیپو کی سلطنت دکن و شمال کی طرف دریائے کرشنا جنوبی ریاست ٹراونکور مشرق میں مشرقی گھاٹ اور مغرب میں ساحلِ سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔

ٹیپو سلطان نے تخت سنبھالنے کے بعد ملکی انتظام پر بھرپور توجہ دی، فوج کو منظم کیا اور اس کی ماہانہ تنخواہ کا نظام جاری کیا۔ اس سے پہلے اس نظام کا کوئی تصور نہ تھا۔ سلطان کی باقاعدہ فوج ایک لاکھ کے قریب تھی۔ ۱۷۸۷ء کے لگ بھگ سلطان نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا جس کو دونوں ہمسایہ ملکوں نے بھی تسلیم کیا۔ خطبے پر مغل حکمراں کی جگہ اپنا نام شامل کرایا۔ نیا روپیہ جاری کیا، نیا تقویم (کیلنڈر) اور سنِ ہجری کی جگہ سنِ محمدیؐ جاری کیا جو آغازِ نبوتؐ سے شروع ہوا۔ انتظامی معاملات درست کیے، نیا آئین نافذ کیا۔ مہینوں کے نئے نام رکھے، اور ملک بھر میں لاتعداد صنعتیں جاری کرائیں۔ سرنگاپٹم میں مسجدِ اعلیٰ کی تعمیر اختتام کو پہنچی۔ یہ وہی مسجد ہے، جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے۔

اس دوران انگریزوں کی سازشیں اور حملے جاری رہے۔ سلطان جرأتِ ایمانی سے مقابلہ کرتے رہے۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ان کے پاس چاہے لاکھ زیادہ لشکر ہو لیکن جب تک ٹیپو سلطان ہے، تب تک ہندوستان پر قبضہ ایک خیال و خواب رہے گا۔ چنانچہ میدانِ جنگ میں شکستیں کھانے کے بعد سازشوں کا سلسلہ چل پڑا۔ ۱۷۹۲ء تک متعدد واقعات ہوئے، سلطان نے انتہائی مشکل حالات میں مقابلہ جاری رکھا۔

جس وقت سلطان ٹیپو شہیدؒ نے تخت سنبھالا تھا، اس وقت برِصغیر کی مُسلم ریاست کئی ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی اور ساری چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں لڑ رہی تھیں۔ سلطان ٹیپو نے اندازہ کر لیا تھا کہ اگر یہ صورتِ حال جاری رہی تو ایک دن انگریز جو صرف مُٹھی بھر ہیں، پورے برِصغیر پر قبضہ کر لیں گے اور خصوصاً مسلمانوں سے اپنی دُشمنی نکالیں گے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ فروری ۱۷۹۹ء تک بہت ساری جنگیں ہوئیں۔ اسی سال کے آغاز میں جنرل ہیرس نے سرنگاپٹم کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ بدقسمتی سے سلطان ٹیپو کے دربار میں غدار بھی موجود تھے جن میں غلام علی لنگڑا، میر صادق اور پُورنیا (ہندو) بھی تھے۔ وہ ہر بات سے انگریزوں کو خبردار کر دیتے تھے۔ آخر کار ۲۲ اپریل ۱۷۹۹ء کو جنرل ہیرس نے صُلح نامہ بھیجا لیکن اس کی شرائط نہایت ذلت آمیز تھیں۔ بہادر سلطان نے جواب میں کہا "میں ایسی ذلیل شرائط پر صُلح نہیں کر سکتا۔ شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

اس کے بعد جنرل ہیرس نے قلعے پر گولہ باری شروع کر دی، وفادار فوجوں نے جوابی گولہ باری کی لیکن غداروں نے اس گولہ باری میں گھاس پھوس اور مٹی ڈلوا دی تھی۔ اس طرح یہ کارروائی بے اثر رہی۔

آخر ۴ مئی ۱۷۹۹ء (۲۹ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ) کی صبح شہادت طلوع ہوئی۔ صبح سویرے ہی انگریزی فوج دریائے کاویری کا دوسو فٹ پاٹ عبور کر کے فصیل کے ایک شگاف پر حملہ آور ہوئی۔ سلطان قلعے کے مورچوں کا معائنہ کر کے واپس آئے تھے اور کھانا نوش فرمانا ہی چاہتے تھے کہ اطلاع ملی، ایک جاں نثار سیّد غفار شہید ہو گئے ہیں۔ سلطان نے ہاتھ کا نوالہ وہیں چھوڑ دیا اور فرمایا "عنقریب ہم بھی جانے والے ہیں۔" اور ڈڈی دروازے کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں ٹکراؤ ہوا۔ انگریزی فوج اندر گھسنے میں اس لیے بھی کامیاب ہوئی کہ پُورنیا غدار نے عین وقت پر وہاں متعین فوج کو تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے بُلا لیا تھا۔ چند جاں نثاروں نے مشورہ بھی دیا کہ آپ کو فرار ہو جانا چاہیے لیکن انھوں نے یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ادھر میر صادق غدار نے باہر نکل کر قلعے کا دروازہ بند کر دیا۔ اور خود شہر کی طرف بھاگا۔ ایک وفادار نے دیکھ لیا اور معاملہ بھانپ کر اس کے پیچھے دوڑا اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس غدار کی گردن اُڑا دی۔

سلطان اب ہر طرف سے دشمنوں میں گھر چکے تھے اور زخمی ہو جانے کے باوجود اُن کی تلوار اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ تیسرا گہرا زخم لگنے پر نڈھال ہو گئے۔ وفادار وں نے پالکی میں ڈال کر لے جانا چاہا لیکن ایک ہجوم نے انھیں پرے دھکیل دیا۔ سلطان زخموں سے لہولہان ہو کر زمین پر گر پڑے۔ ایک سپاہی نے ان کی بیش قیمت پیٹی اُتارنا چاہی۔ سلطان میں ابھی زندگی کی رمق اور غیرت کا جوش اُبل رہا تھا۔ فوراً تلوار سے وار کیا اور سپاہی کو کاٹ کر پرے پھینک دیا۔ ایک اور سپاہی یا شاید اُسی سپاہی نے سلطان کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ اور برِصغیر میں مسلمانوں کی جدّوجہد

آزادی کا آخری چراغ جھلملا کر بجھ گیا۔

اگلے روز ۵ مئی ۱۷۹۹ء کو سلطان ٹیپو کو پورے اعزاز کے ساتھ ان کے والد حیدر علی کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

سلطان ٹیپو شہیدؒ بہت بڑے مجاہد اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے، سارا دن باوضو رہتے تھے۔ اُن کے پابندِ شریعت ہونے کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے، جو اس مضمون کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان شہیدؒ نے ساری عمر کوئی نماز قضا نہیں کی۔ وہ دن کا آغاز صُبح سویرے قرآنِ کریم کی تلاوت سے کرتے تھے۔ وہ خود عالم تھے اور اہلِ علم کی قدر کرتے تھے۔ آپ کا ذاتی کُتب خانہ ہندوستان کے چند بڑے کُتب خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ سُلطان شریعتِ محمدیؐ کے سختی سے پابند تھے۔ اس حد تک کہ حمام میں بھی لنگوٹ باندھ کر غسل فرماتے۔ آخری عُمر میں سبز رنگ کی دستار زیبِ سر فرمائی۔

تمام سرکاری فرامین پر اپنے ہاتھ سے بسم اللہ لکھتے تھے۔ ذاتی طور پر بھی وہ شریعت کے نہایت پابند تھے اور ہر قسم کی چھوٹی بڑی خلافِ شرع باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ شجاعت اور بہادری میں کوئی آپ کا ہم سر نہ تھا۔ یہاں تک کہ خود ان کے سب سے بڑے دشمن انگریزوں نے بھی اُن کو "شیرِ میسور" کا خطاب دیا تھا۔

جہاں سلطان پکے مسلمان تھے، وہاں وہ تعصب سے بھی پاک تھے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ پورنیا جیسے غدار اور نمک خوار ہندو آپ کی حکومت میں وزیر تھے۔ اور کئی مندروں کو آپ نے جاگیریں عطا کر رکھی تھیں۔

سُلطان شہیدؒ آج ہمارے درمیان نہیں لیکن جب تک اُفق پر لہو رنگ شفق چمکتی ہے اور آسمان پر سُورج روشن ہے۔ سُلطان ٹیپو زندہ رہیں گے۔

۱۰۴ صفحات پر مشتمل

راہنما

بچوں قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچی کہانیاں بچوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجیے

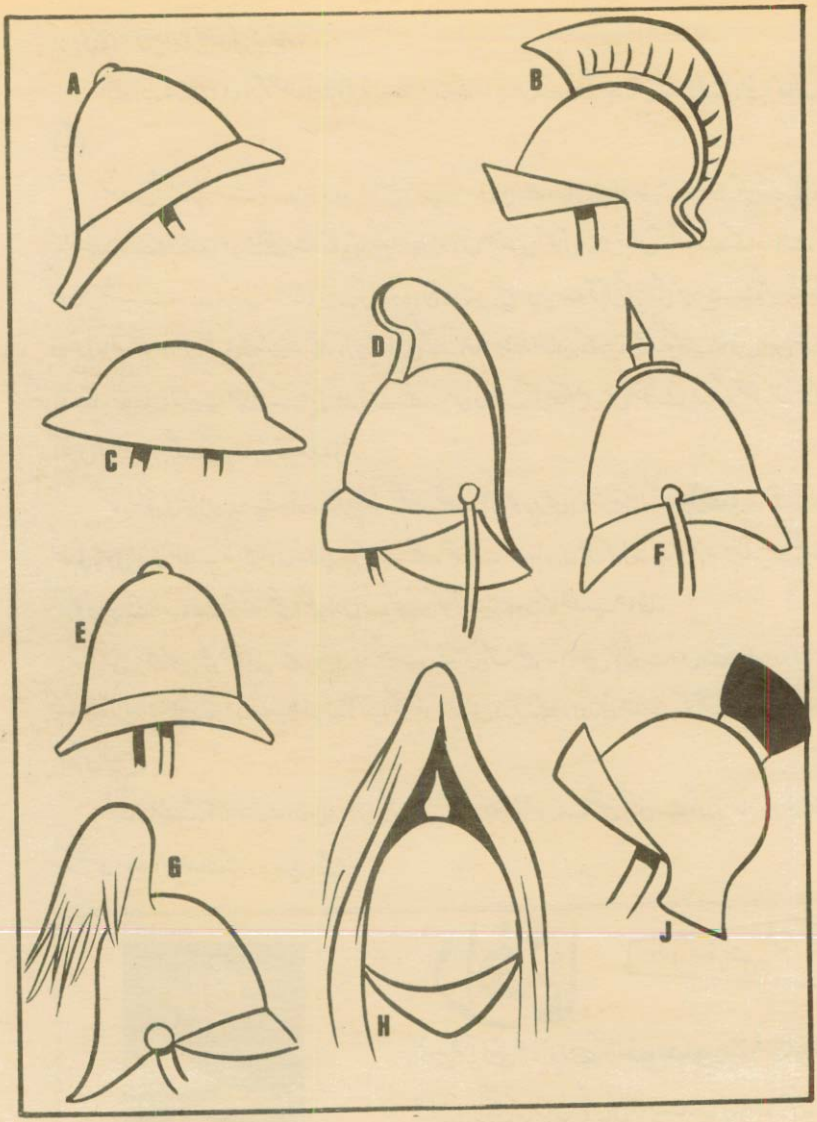

آپ یہ مختلف ڈیزائن اور سائز کے ہیلمٹ دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قسم کے ہیں اور انھیں کون لوگ استعمال کرتے ہیں؟

سیرتِ طیّبہ پر لکھی جانے والی معرکتہ الآرا کتاب جسے بطورِ خاص

بچّوں اور طالب علموں کے لیے تحریر کیا گیا

مشہور محقق سیّد نظر زیدی کا تحفۂ خاص، جس نے صدارتی ایوارڈ حاصل کیا

سب سے بڑا انسانؐ

- سیرتؐ کے موضوع پر بیش بہا معلومات
- عام فہم، آسان اور دلنشیں اندازِ تحریر
- ۱۹۰ حسین آفسٹ صفحات،
- دلکش کمپوزنگ، عمدہ طباعت
- چار رنگوں کا حسین اور لیمینیٹڈ سرورق

الحمدللہ

اس خوبصورت کتاب کو شائع کرنے کی سعادت ادارۂ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی نے حاصل کی۔

ہدیہ:- ۴۰ (چالیس روپے) (منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کی شکل میں بھجوائیں)

ڈاک خرچ ادارے کے ذمّے ہوگا۔

نوٹ

طلبہ وطالبات اپنے ادارے کے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا کر یہ کتاب آدھی قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں

کتاب منگوانے کا پتہ:-

"سب سے بڑا انسانؐ" گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ڈی۔ ۱۱۲۔ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

ایک بار کی زحمت
سال بھر کا آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے ہر ماہ حاصل کرنے کے لیے

صرف ایک بار زحمت کیجیے اور ۱۲ ماہ تک اپنا پسندیدہ رسالہ باقاعدگی سے حاصل کیجیے۔

آنکھ مچولی کے (۱۲) شماروں کی قیمت مع دو خاص نمبر اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ (۱۳۲) روپے بنتی ہے، لیکن خصوصی بچت اسکیم کے تحت آپ کو صرف (۹۰) روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں گویا بیک وقت آپ دو فائدے اٹھا سکتے ہیں۔

① ۴۲ روپے کی خصوصی بچت۔

② گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے کی بحفاظت ترسیل۔

یاد رہے کہ

رسالے کی قیمت میں اضافے کے باوجود زرِ سالانہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اگر آپ سالانہ خریداری کے لیے ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتے ہوں تو ۹۰ روپے کا منی آرڈر اور مندرجہ ذیل کوائف ایک علیحدہ کاغذ پر روانہ کریں۔

① خریدار کا نام ② مکمل پتہ ③ رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے ④ فون نمبر (اگر ہو) ⑤ دستخط

"خصوصی بچت اسکیم" ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ڈی-۱۱۲۔ نورس روڈ سائٹ کراچی ۱۶

HICKY's
BENGAL GAZETTE
OR,
Calcutta General Advertiser
[No. VII.]
Saturday March the 11 1780.

FOREIGN INTELLIGENCE.
FRANCE.

ENGLAND.

برِّصغیر کا پہلا اخبار کیسے نِکلا؟

طاہر مسعود

کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا بھر کی حکومتیں سب سے زیادہ کس سے ڈرتی ہیں؟ اخبار سے۔۔۔ جی ہاں اخبار ہی ایسی طاقت ہے جس سے حکومتیں خوفزدہ رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ اس کی قوّت اور زور کسی طرح گھٹ جائے۔ اس کے لیے وہ اخباروں کو پابند بناتی ہیں، ان کی آزادی چھیننے کے لیے طرح طرح کے قوانین وضع کرتی ہیں۔ نپولین دنیا کا کتنا جری اور زبردست فاتح تھا لیکن وہ کہتا تھا کہ میں سو سنگینوں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا ایک اخبار سے ڈرتا ہوں۔ آپ یقیناً سوچیں گے کہ کاغذ کا ایسا پلندہ جو صبح کو اخبار اور دوپہر میں دستر خوان بن جاتا ہو، بھلا اتنا طاقتور کیسے ہو سکتا ہے۔ تو پھر آئیے اخبار کے اس زور و قوت کو واضح کرنے کے لیے آپ کو ہم چند دلچسپ واقعات سُنائیں۔

ایک زمانے میں دُنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح برِصغیر میں بھی اخبارات نہیں ہوتے تھے اور لوگ باگ ہماری آپ کی طرح صبح سویرے اُٹھ کر اخبار نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے ایک شہر کے لوگ دوسرے شہر کے لوگوں کے حال سے بے خبر ہی رہتے تھے البتہ بادشاہوں کو چونکہ اپنی رعایا کے حالات سے باخبر رہنا

ضروری ہوتا تھا اسی لیے بادشاہ ہر شہر میں اپنے نامہ نگار مقرر کر دیتا تھا جو بادشاہ کو اہم واقعات سے مطلع کرتا رہتا تھا۔ لیکن نامہ نگاری یہ اطلاعات صرف بادشاہ کے لیے ہوتی تھیں۔ عام لوگ تو بے چارے دُور دراز کا سفر طے کر کے آنے والوں سے دنیا کے حالات معلوم کرتے تھے اور چونکہ سفر میں مہینوں لگ جاتے تھے اس لیے مسافروں کے پاس بھی پُرانی خبریں ہوتی تھیں۔ پھر جب ہندوستان پر برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہوا تو اُسی زمانے میں پہلی مرتبہ باقاعدہ طریقے سے اخبارات نکلنے شروع ہوئے۔ یہاں اخبارات کے شروع ہونے کا قصہ بھی عجیب و غریب ہی ہے۔

یہ تو آپ کو پتہ ہی ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں تجارت کرنے کے بہانے سے آئی تھی۔ ہندوستان کی دولت نے کمپنی کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا تھا۔ لہٰذا اس نے تجارت کی آڑ میں ہندوستان پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چونکہ مُغلیہ حکومت کمزور پڑ چکی تھی اور مختلف ریاستیں آزاد ہو گئی تھیں۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے یہ بہت آسان ہو گیا کہ وہ اپنی چالبازیوں اور عیاریوں سے باری باری سب کو شکست دے دے۔ کمپنی کا مقصد ہندوستان کی دولت کو لوٹنا تھا اور کمپنی کے ہمراہ جو انگریز برطانیہ سے آئے تھے ان کی اصل نیت یہی تھی کہ وہ یہاں سے سارا مال متاع سمیٹ کر برطانیہ لے جائیں اور ٹھاٹھ کی زندگی بسر کریں۔ جب نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دھوکہ بازی اور غداری سے شکست دے دی تو کمپنی کے عہدیداروں کو اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کا سنہرا موقعہ ہاتھ آگیا لیکن کمپنی میں بہت سے ملازمین ایسے بھی تھے جنہیں اس لُوٹ میں برابر کا حصّہ نہیں مل رہا تھا اس لیے وہ ناراض ہو گئے تھے۔ اور بعض ایسے تھے جنہیں کمپنی کے بڑے عہدیداروں نے کسی سیاسی ناراضگی کی وجہ سے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ انہی لوگوں میں ایک صاحب مسٹر ولیم بولٹس تھے۔ مسٹر بولٹس نسلاً ولندیزی تھے، جیسے تیسے ہندوستان پہنچ کر انہوں نے کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ وہ اپنا نجی کاروبار بھی کرتے تھے جو قانوناً جرم تھا۔ جب کمپنی نے اُنہیں ملازمت سے علیحدہ کیا تو مسٹر بولٹس نے اخبار نکالنے کا عزم کیا۔ اس لحاظ سے وہ پہلے آدمی تھے جنہیں ہندوستان میں پہلی بار اخبار نکالنے کا خیال آیا۔ مسٹر بولٹس نے اس مقصد کے لیے ایک اشتہار کلکتہ کونسل ہاؤس کے دروازے پر چسپاں کر دیا۔ اس اشتہار میں عوام کو مطلع کیا گیا تھا کہ چونکہ شہر میں نہ چھاپہ ہے اور نہ خبر رسانی کی سہولت موجود ہے اس لیے جو صاحب خبر رسانی کے فن سے واقف ہوں اور چھپائی کا کام کرنا چاہیں تو مسٹر بولٹس ان کی پوری ہمت افزائی کریں گے۔ اس اشتہار میں ایک اور مزیدار بات یہ کہی گئی تھی کہ مسٹر بولٹس کے پاس کچھ کاغذات اور مسوّدات ایسے ہیں جن کا تعلق پبلک سے ہے۔ کوئی صاحب اگر ان مسوّدات کو

پڑھنا چاہیں تو مسٹر بولٹس کے مکان پر آکر پڑھ سکتے ہیں اور نقل کرنا چاہیں تو نقل بھی کر سکتے ہیں۔ ہر روز ایک آدمی دس بجے سے بارہ بجے تک اس خدمت کے لیے وہاں موجود رہے گا۔

اس اشتہار کو پڑھتے ہی کمپنی گھبرا گئی۔ اس نے فوراً ایک اجلاس میں فیصلہ کیا کہ مسٹر ولیم بولٹس چونکہ کمپنی کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں لہٰذا وہ فوری طور پر یورپ واپس چلے جائیں۔ اس طرح مسٹر ولیم بولٹس کے اخبار نکالنے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا اور انہیں ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔ اس واقعے کے بارہ برس بعد بالآخر ایک اخبار نکل آیا جس کا نام تھا "ہکیز بنگال گزٹ یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائیزر" اور اخبار کے نکالنے والے تھے مسٹر جیمز آگسٹس ہکی۔ یہ واقعہ ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کا ہے۔ یہ چار صفحوں کا اخبار تھا۔ جس میں نامہ نگاروں کے خطوط اور یورپ سے آئی ہوئی خبروں کا خلاصہ چھپا تھا۔ اخبار میں چونکہ کمپنی کے ملازمین کے خلاف باتیں درج تھیں اس وجہ سے کمپنی مسٹر ہکی کی مخالف ہوگئی۔ مسٹر ہکی اپنے اخبار میں مختلف تاجروں، افسروں اور پادریوں کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ لہٰذا جب انہوں نے ذکریا کئی اینڈرنام کے ایک پادری کے خلاف لکھا تو پادری موصوف نے ہکی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ جس پر عدالت نے مسٹر ہکی کو ایک شریف آدمی پر جھوٹے الزامات لگانے کے جرم میں چار مہینے کی قید سزا دی اور چار سو روپے جرمانہ کیا۔ مسٹر ہکی اس سزا سے ڈرنے کے بجائے اور دیدہ دلیری سے لکھنے لگے۔ اس زمانے میں اخبار ہاکروں کے بجائے ڈاک سے تقسیم ہوتا تھا۔ کمپنی کے گورنر جنرل نے ہکی کے اخبار کو محکمہ ڈاک سے تقسیم ہونے پر پابندی لگا دی۔ جس کے جواب میں ہکی نے اس اقدام کو غیر قانونی قرار دیا اور لکھا کہ "جلد ہی وہ ان لوگوں کو اگر منٹ کو بتلا دیں گے کہ ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے ان کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ ظلم توڑنے والوں کے سامنے جھکنے، ناک رگڑنے یا دُم ہلانے پر ان کو مجبور کرنے سے پہلے اخبار کی خریداری کو روکنا پڑے گا۔"

مزے کی بات یہ دیکھیے کہ مسٹر ہکی نے خریداروں میں اخبار تقسیم کرنے کے لیے بیس ہرکارے ملازم رکھ لیے۔ جنہیں وہ چار سو روپے دیتے تھے تاکہ وہ ان کا اخبار پڑھنے والوں تک پہنچا دیں۔ اس صورتحال سے کمپنی کی حکومت پریشان ہوگئی کیونکہ اُس کا تیر خالی چلا گیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ حکومت مسٹر ہکی کو گرفتار کرلے۔ مسٹر ہکی کو حکومت کے اس ارادے کا علم ہوگیا۔ لہٰذا انہوں نے گرفتاری سے بچنے کے لیے بہت سے لوگ اپنی حمایت میں جمع کر لیے۔ حکومت کو اس کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس لیے اُس نے مسٹر ہکی کو گرفتار کرنے کے لیے پورا ایک مسلح دستہ بھیجا، لیکن مسٹر ہکی کے آدمیوں نے پولیس کے دستے پر حملہ کر کے اُسے مار بھگایا۔ مسٹر ہکی کو معلوم تھا کہ حکومت اب انہیں ہر صورت میں گرفتار کرے گی اس لیے وہ اسی روز سپریم

کورٹ میں حاضر ہو گئے تاکہ اس سے مدد حاصل کر سکیں۔ بدقسمتی سے عدالت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ مسٹر ہکی کو حراست میں لے کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن انہوں نے ضمانت کی درخواست داخل کی تو عدالت نے ۸۰ ہزار کی ضمانت طلب کی۔ اتنی بڑی رقم مسٹر ہکی کہاں سے ادا کرتے بے چارے حوالات میں بند رہے پھر انہیں ایک سال کی سزا ہو گئی، لیکن اُن کی ہمت دیکھیے کہ قید میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے اپنا اخبار جاری رکھا۔

سزا کاٹ کر مسٹر ہکی باہر آئے تو حکومت کا خیال تھا کہ شاید اب ان کا دماغ درُست ہو چکا ہو گا لیکن مسٹر ہکی پر سزا کا مطلق اثر نہ تھا وہ اُسی جوانمردی سے اب بھی کمپنی کی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ تھے۔ بالآخر تنگ آکر حکومت نے مسٹر ہکی کا چھاپہ خانہ ضبط کر لیا اور یوں اس بے باک اخبار کی زندگی کا چراغ گُل ہو گیا۔

"ہکیز گزٹ" کے بعد ہندوستان میں اخبار نکلنا شروع ہو گئے۔ دوسرا اخبار "انڈیا گزٹ" کو مسٹر ہکی کے اخبار کا مقابلہ کرنے اور کمپنی کی حکومت کی حمایت ہی میں نکالا گیا تھا۔ اس لیے مسٹر جیمز آگسٹس ہکی کو ہندوستان میں اخبار نویسی کا باوا آدم کہا جائے تو غلط نہ ہو گا لیکن مسٹر ہکی نے آزاد صحافت کی جو داغ بیل ڈال دی تھی کچھ اسی کا اثر تھا اور کچھ اخبارات کی اپنی ضروریات کا کہ بعد میں نکلنے والے اخبارات نے بھی حکومت پر تنقید جاری رکھی یا بعض ایسی خبریں چھاپ دیں جن کا چھاپنا حکومت کو پسند نہ تھا۔ جس کے نتیجے میں کئی ایڈیٹر ہندوستان سے نکال باہر کیے گئے۔ ان میں مثلاً "بنگال جرنل" کے ایڈیٹر مسٹر ولیم ڈون (William Duane) اور "بنگال ہرکارو" کے ایڈیٹر ڈاکٹر چارلس میک لین تھے۔ ان ایڈیٹروں سے حکومت اتنی خوفزدہ تھی کہ ڈاکٹر میک لین کے تو نجی خطوط تک سنسر کیے جاتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ڈاکخانے نے اُن کے کچھ خطوط بھی روک لیے اور پھر بعد میں انھیں زبردستی ہندوستان بھیج دیا گیا۔ اس طرح مسٹر ولیم ڈون کے گھر کی دو مرتبہ تلاشی لی گئی اور جب عدالت نے بھی مسٹر ڈون کے گھر کی تلاشی لینے کا حکم دیا تو مسٹر ڈون نے عدالت کو درخواست دی کہ اُسے بتایا جائے کہ اُن کے گھر کی تلاشی کن وجوہات کی بنا پر لی گئی ہے۔ اس کا جواب سپریم کورٹ کے بجائے حکومت نے یہ دیا کہ حکومت کی خواہش ہے کہ وہ پہلے جہاز سے انگلستان چلے جائیں۔

ولیم ڈون نے اس حکم کے خلاف اپیل کی اور درخواست دی کہ وہ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار سر جان شور سے اسی سلسلے میں ملنا چاہتا ہے۔ حکومت نے یہ درخواست منظور کر لی۔ لیکن جب مسٹر ڈون گورنمنٹ ہاؤس پہنچے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور پھر زبردستی انھیں انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ ان ایڈیٹروں سے اس بے رحمی

اور عیاری کا سلوک صرف اس لیے روا رکھا گیا کیونکہ یہ حضرات اپنے اپنے اخبار میں آزادی کے ساتھ وہ سب کچھ لکھنا چاہتے تھے جو اردگرد پیش آ رہا تھا۔ جبکہ حکومت چاہتی تھی، صحافی حضرات صرف وہی لکھیں جو حکومت کے مفاد میں ہو، جس سے حکومت کے خلاف بددلی نہ پھیلے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے کہ حکومت اخباروں کو اپنا حامی بنانا چاہتی ہے اور سچے اخبارات کی رائے یہ ہوتی ہے کہ چونکہ حکومت انسانوں کی ہوتی ہے اس لیے اس سے غلطی بھی سرزد ہو سکتی ہے اخبار کا کام اسی غلطی کی نشاندہی کرنا ہے تاکہ حکومت اس کی اصلاح کر سکے۔ متحدہ ہندوستان میں اخبار نویسی اپنی ابتدا ہی سے حکومت سے اُلجھ گئی اور ایک ہندوستان میں کیا دُنیا میں ہر جگہ اخبارات کو اسی صورتِ حال سے سامنا رہا ہے۔ جس کی کہانی ہم آپ کو آئندہ بھی سُناتے رہیں گے۔

کامیابی مبارک

ملک بھر کے لاتعداد اسکولوں کے امتحانی نتائج کے مطابق ہمارے بے شمار ساتھی امتحان میں شاندار کامیابیاں حاصل کر چکے ہیں

کامیابی کی ان خوشیوں میں

آنکھ مچولی

بھی شریک ہے

خُدا کرے مستقبل میں دین و دُنیا کی ایسی بہت سی کامیابیاں آپ کے قدم چُومیں اور آپ روز و شب کی محنت اور لگن سے اپنے امّی ابّو کی توقعات پر پُورا اُتریں اور ملک و قوم کی سرخروئی کا باعث بنیں

- جو ساتھی کسی وجہ سے پاس نہیں ہو سکے۔ وہ اپنا دِل چھوٹا نہ کریں اور اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لے کر پھر سے محنت کریں۔ انشاء اللہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔
- جو ساتھی پاس ہو گئے ہیں، وہ ان خوشیوں میں ان دوستوں کو نہ بھُولیں، جن کے لیے تعلیمی اخراجات شدید بوجھ ہیں۔ اپنی کتابیں مستحق طالبعلموں کو دے کر تحریکِ فروغِ علم میں حصّہ لیں اور اجر و ثواب پائیں۔

PID (Islamabad)
manhattan International

محمد سلیم مغل

میرا دِل تیری دھڑکن

یہ کوئی فلمی کہانی نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے جو کسی معجزے سے کم نہیں

اس تصویر کو دیکھ کر شاید آپ یہ سمجھ رہے ہوں کہ دل کی دھڑکن سُننے والا آلہ اسٹیتھو اسکوپ کہیں سے اس بچّی کے ہاتھ لگ گیا ہے اور وہ بچے کے دل کی دھڑکن سُن کر خوش ہو رہی ہو۔ جی نہیں! ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بچّی اس لڑکے کے سینے میں موجود اپنے ہی دل کی دھڑکن سُن کر خوشی سے پھُولے نہیں سما رہی... شاید آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آیا... اور اگر آئے بھی تو کیوں؟ یہ بات بظاہر ہے بھی تو ناقابلِ یقین... پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بچّی نے اپنا دل بچے کو دے دیا ہے تو وہ خود کیسے زندہ ہے؟ اور اگر اُس نے خود کسی اور کا دل لے لیا ہے تو ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی کہ اُسے اپنا دل کسی اور کو دے کر اپنے لیے ایک اور دل حاصل کرنا پڑا؟

آئیے ہم آپ کو اس معجزاتی حقیقت کا احوال بتاتے ہیں جسے پڑھ کر آپ یقیناً دم بخود رہ جائیں گے۔

انگلستان میں رہنے والی ۱۴ سالہ اس بچّی کا نام سمانتھا ہے۔ یہ بچّی اپنے امّی ابّو اور اہلِ خانہ کے ساتھ خوش خوش رہا کرتی تھی۔ پھر ہُوا یہ کہ بدقسمتی سے اس کے پھیپھڑوں میں کوئی نقص ہو گیا اور یہ مرض بڑھتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ اس مرض نے ایک خطرناک شکل اختیار کر لی جسے Cystic Fibrosis کہتے ہیں۔ یہ مرض اکثر جان لیوا بھی ہو جاتا ہے ایسا ہی خطرہ سمانتھا کو بھی درپیش تھا۔ اور ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اگر سمانتھا کو نئے صحت مند پھیپھڑے نہ لگائے

گئے تو یہ زیادہ روز تک زندہ نہ رہ سکے گی۔ یہ تو تھی ایک مشکل لیکن اس سے بھی بڑی مشکل جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ماہرین کی رائے کے مطابق سمانتھا کا دل کسی اور پھیپھڑے کو قبول نہیں کرے گا۔ لہٰذا یہ ضروری قرار پایا کہ جس کے پھیپھڑے لیے جائیں دل بھی اُسی کا ہو۔

ڈاکٹرز کے خیال میں اس مجبوری کا کوئی اور حل نہیں تھا۔ یہ بات جب سمانتھا کو بتائی گئی تو وہ قدرے پریشان تو ہوئی مگر اس نے اچھے بچوں کی طرح ہمت سے کام لیا اور اس شرط پر آپریشن کے لیے تیار ہو گئی کہ اُس کے صحت مند دل کو ضائع نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہ دل کسی ضرورت مند کو دے کر اس کی جان بچائی جائے گی۔ ڈاکٹر نے دوڑ دھوپ شروع کر دی اور بالآخر ایک ایسے بچے کو تلاش کر لیا جس کا دل بالکل ناکارہ ہو چکا تھا۔ اور اس کی زندگی کو بچانے کے لیے ایک نئے اور صحت مند دل کی ضرورت تھی۔ یہ بچہ ۱۰ سالہ اینڈریو تھا... اینڈریو کی امّی نے بتایا کہ اینڈریو کو اُس وقت سینے کا انفکشن ہُوا جب وہ شیر خوار تھا۔ اُس کے بعد اُسے گردن توڑ بخار رہُوا جس کے بعد سے وہ پوری طرح سے صحت یاب نہ ہو سکا۔ اُس کا رنگ زرد رہنے لگا، اُس کا دل ناکارہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آپریشن سے کچھ عرصہ قبل وہ چند گز بھی نہیں چل سکتا تھا۔

بڑے سے بڑے خطرے میں جب کسی کی زندگی کو بچنا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے اسباب مہیا کر دیتا ہے کہ سارے کام سنورتے چلے جاتے ہیں اور تمام خطرے خود بخود ٹل جاتے ہیں۔ یہی کچھ ان دونوں بچوں کے ساتھ بھی ہُوا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۸۷ء کو دونوں بچے اسپتال میں لائے گئے اور انہیں آپریشن کی غرض سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے آپریشن تھیٹر میں رکھا گیا۔ انگلستان کے بہت بڑے دل کے سرجن Magdi Jacoub نے ان کا آپریشن کیا... عین اُسی روز حادثے میں زخمی ہونے اور بالآخر چل بسنے والے ایک شخص کے پھیپھڑے اور دل حاصل کر کے سمانتھا کو لگائے گئے۔ جبکہ سمانتھا کا صحت مند دل اینڈریو کے سینے میں لگا دیا گیا۔ تین ماہ کے اندر اندر دونوں بچے صحت مند ہو گئے۔ بالکل صحت مند، ہشاش بشاش، چاق و چوبند، ایسے کہ آپ

دیکھیں تو آپ کو یقین نہ آئے... سمانتھا کی امی کہتی ہیں کہ سمانتھا گھنٹوں تک رقص کر سکتی ہے اور اُسے کسی طرح کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ اینڈریو... فٹبال کھیلتا ہے اور اس کھیل کے دوران اس کا دل بھی صحت مند کھلاڑیوں کی طرح دھڑکتا ہے۔

اسپتال کے تین مہینوں میں دونوں بچوں کے خاندان ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے... اتنے قریب کہ جیسے ایک ہی خاندان ہو... اینڈریو کی امی کہتی ہیں کہ ہمیں تو سمانتھا فرشتہ بن کر ملی اور اس نے ہمارے بیٹے کی زندگی بچالی۔

سمانتھا کہتی ہے: "مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں اینڈریو کو ہمیشہ سے جانتی تھی اور اب میں اُسے کبھی نہیں بھولوں گی۔"

اینڈریو بھی سمانتھا کے لیے ایسے ہی جذبات رکھتا ہے، وہ کہتا ہے "سمانتھا میری بڑی بہنوں کی طرح ہے، میرے دل میں اُس کے لیے بے حد احترام اور محبت ہے۔"

اسپتال میں تین ماہ کا قیام دونوں بچوں اور ان کے بڑوں میں محبت کا ایسا رشتہ استوار کر گیا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اسپتال میں قیام کے دوران جب کرسمس کا موقعہ آیا تو سمانتھا نے اینڈریو کو سینٹ کرسٹوفر کا ایک ایسا تحفہ دیا جس پر لکھا تھا... "دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ" اسی طرح اینڈریو کی جانب سے سمانتھا کو ایک حسین لاکٹ دیا گیا۔ یہ لاکٹ کیا تھا؟ سونے کی چین کے ساتھ سونے کا ایک دل تھا۔

دلوں کے تبادلے کا یہ احوال بظاہر ایک ناقابلِ یقین سی بات معلوم ہوتی ہے مگر سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے زندگی دے اور جسے چاہے موت... اینڈریو اور سمانتھا کی زندگیاں بھی اللہ تعالیٰ کا ایسا انعام ہے جس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

نتائج کی پٹاری کھلنے والی ہے

ہماری دعوت پر آپ نے اپنی نگارشات ہمیں بھجوائیں۔
لاتعداد تحریروں پر، بے حد و حساب محبتوں پر
ہمارا شکریہ قبول کیجیے

یقیناً آپ کو نتائج کا بے چینی سے انتظار ہوگا۔
نتائج کے لیے جولائی کے خاص نمبر کا انتظار کیجیے
جولائی کا خاص نمبر کس موضوع پر ہوگا...

یہ پُرتجسس جواب آئندہ ماہ کے شمارے میں دیکھئے

ہاتھی

تھا اک جنگل میں اک بوڑھا سا ہاتھی
نہ تھا دُنیا میں جس کا کوئی ساتھی

اکیلا پھرتا تھا وہ مارا مارا
تھا سُوکھی گھاس پہ اُس کا گزارا

وہ جب ہرنوں کی ڈاریں دیکھ پاتا
اُسے گزرا زمانہ یاد آتا

کبھی رہتا تھا وہ بھی ہاتھیوں میں
مگن پھرتا تھا اپنے ساتھیوں میں

مزے سے گھومتا جنگل میں پھرتا
جہاں کی نعمتوں سے پیٹ بھرتا

درختوں کو کبھی جڑ سے گراتا
کبھی کھیتوں میں جا اُودھم مچاتا

نہ تھا طاقت میں کوئی اس کا ثانی
سب اُس کے سامنے بھرتے تھے پانی

اُسے اپنا بڑا سب مانتے تھے
وہ ہے سب سے قوی سب جانتے تھے

گھمنڈ اس میں جو طاقت کا سمایا
ہر اک ساتھی کا اُس نے دِل دکھایا

ہر ایک کو مارتا پھٹکارتا وہ
جو پاس آتا اُسے دُھتکارتا وہ

غرور اس کا جو دیکھا ہاتھیوں نے
تو چھوڑا ساتھ سارے ساتھیوں نے

بھرے جنگل میں تھا وہ اب اکیلا
نہ تھے ساتھی نہ اب وہ موج میلہ

جدھر جاتا سب اُس پر نام دھرتے
لڑاکو کہہ کے اُس کو تنگ کرتے

جستجو شرط ہے

ذہانت اور معلومات کا منفرد ماہانہ مقابلہ

امامہ بن سلیم

جستجو شرط ہے کا پانچواں مقابلہ پیش خدمت ہے۔ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ یہ صرف معلومات ہی کا نہیں ذہانت کا بھی مقابلہ ہے۔۔۔ اپنی ذہانت کو سوالات کی اس کسوٹی پر پرکھیے اور دیکھیے کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔

اس مقابلے میں شرکت کا طریقہ تو آپ کو یاد ہو گیا ہو گا مگر چونکہ ہر ماہ نئے ساتھی آنکھ مچولی کے حلقے میں شامل ہوتے رہتے ہیں اس لیے ہم شرکت کا طریقہ بھی دہرائے دیتے ہیں۔ نئے ساتھی یہ طریقہ پھر جان لیں۔ ہر سوال کا جواب اس کے ساتھ دیے گئے الفاظ میں موجود ہے۔ ہر لفظ سے ایک حرف چُنیں اور تمام حروف کو ملا کر مطلوبہ لفظ بنا لیں۔ یہی آپ کا جواب ہو گا۔ آپ کی سہولت کے لیے اشارے کے طور سے شعر کا ایک مصرعہ بھی ہر سوال کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ یہ مصرعہ صحیح جواب تک پہنچنے میں آپ کا مددگار ہو سکتا ہے۔

صحیح جوابات بھجوانے والے ساتھیوں میں تین کو بذریعہ قرعہ اندازی خوبصورت انعامات بھی بھجوائے جائیں گے۔

ضروری ہے کہ آپ کے جوابات ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک ہمیں موصول ہو جائیں۔ جواب کے ساتھ کوپن کا آنا اس ماہ سے لازمی ہے۔۔۔ (ادارہ)

سوالات

۱۔ آزادی کی نامور شخصیات میں ایک قلندر صفت شخصیت کا نام تلاش کیجیے۔
ا۔محسن الملک ۲۔سرسید احمد خان ۳۔وقار الملک ۴۔شوکت علی۔
اشارہ:۔ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا...؟

۲۔ دنیا کے معروف اخبارات میں سے ایک ... آپ کو اشارے کی مدد سے نام بتانا ہے۔
ا۔واشنگٹن پوسٹ ۲۔انڈین ایکسپریس ۳۔نیویارک ٹائمز ۴۔ڈان ۵۔خلیج ٹائمز ۶۔گلف نیوز
اشارہ:۔ اخبار سرپرست بنا ہے عوام کا

۳۔ دنیا کی نامور شخصیات کے ناموں میں ایک ایسی ہی نامور شخصیت۔؟
ا۔سکندر اعظم ۲۔بیتھ اوون ۳۔بنجامن فرینکلن ۴۔گلیلیو ۵۔روز ویلٹ ۶۔شیکسپیئر
۷۔جولیس سیزر
اشارہ اک بڑی سرزمیں کا بڑا نام ہے۔ اس کے اقوال کا تذکرہ عام ہے۔

۴۔ دنیا کی مشہور ایئر لائنوں سے ایک مشہور ترین ایئر لائن؟ نام بتائیے۔
ا۔گلف ایئر ۲۔ائیر فلوٹ ۳۔کویت ایئر ویز ۴۔تھا ۵۔پین ایم ۶۔سیمان ۷۔ایئر فرانس
۸۔ایئر انڈیا۔
اشارہ:۔ لطف آگیا جو مل گیا کپڑے کا ایک تھان سا۔

۵۔ دُنیا کے مختلف ملکوں کی اہم سیاسی پارٹیوں میں سے ایک سیاسی پارٹی کا نام... تلاش کیجیے اور بتائیے؟
ا۔ری پبلکن (امریکہ) ۲۔حزبِ اسلامی (افغانستان) ۳۔کانگریس (بھارت) ۴۔مسلم لیگ (پاکستان)
اشارہ:۔ یہ اپنی ذات میں اور نام میں آزاد رہتی ہے۔

۶۔ خلائی ٹیکنالوجی میں اس نام کو آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ شٹل ۲۔ اپولو ۳۔ چاند گاڑی ۴۔ اسکائی لیب
اشارہ:۔ ایسے بھی اب نخرے کیا کچھ تو کھاؤ کچھ تو لونا

۷۔ دنیا کی اہم نیوز ایجنسیوں میں اس نیوز ایجنسی کا نام تلاش کیجیے۔
۱۔ طاس ۲۔ رائٹرز ۳۔ یو این آئی ۴۔ اے پی پی
اشارہ:۔ یہ چاروں حرف انگلش کے بنتے ہیں ہم وزن "گرنا"

۸۔ آخرت کا تصور ذہن میں رکھتے ہوئے اس نام کو تلاش کیجیے۔ آپ بہ آسانی اس نام تک پہنچ جائیں گے۔
۱۔ عزرفات ۲۔ صور ۳۔ میزان عدل ۴۔ حور ۵۔ اسرافیل
اشارہ:۔ سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

۹۔ دنیا بھر کے چھوٹے بڑے سمندروں میں اس سمندر کو تلاش کیجیے۔
۱۔ بحیرۂ عرب ۲۔ بحرِ اوقیانوس ۳۔ بحیرۂ روم ۴۔ بحر الکاہل ۵۔ بحر منجمد شمالی ۶۔ بحرِ مردار
اشارہ:۔ ایک سمندر ایسا جس کو اس خطے سے نسبت ٹھہری

۱۰۔ ایک ملک کا نام تلاش کرنا مقصود ہے... ممکن ہے یہ نام بہت مشہور نہ ہو۔
۱۔ بھوٹان ۲۔ کوریا ۳۔ روس ۴۔ چین ۵۔ ڈنمارک ۶۔ جرمنی
اشارہ:۔ نظروں میں نہ آنے والا، نقشے میں کھو جانے والا۔ ملک ہے ننھا منا

جوابات "جستجو شرط ہے" مقابلہ نمبر ۳
ماہ مارچ ۱۹۸۹ء

۱۔ مقاماتِ مقدسہ میں ایک مقدس نام "مقامِ ابراہیم" ہے۔
۲۔ وہ علاقہ جو کبھی ہمارا تھا۔ اب دیارِ غیر کا حصہ ہے "کاشغر" ہے۔
۳۔ جس پرندے کی ہمیں تلاش تھی وہ "پپیہا" ہے
۴۔ بہت سے علوم میں چھپا ہوا ایک علم "رمل" ہے
۵۔ جانوروں میں ایک جانور "لاما" جو چین میں پایا

جاتا ہے۔

۶۔ امریکی صدور کے بہت سے ناموں میں ایک نام "لنکن" ہے۔

۷۔ غذاؤں میں پوشیدہ غذائی قوت "گلوکوز" ہے۔

۸۔ ظالموں میں ایک ظالم، جس کا نام آج بھی نمونۂ عبرت ہے۔ یہ "نمرود" ہے۔

۹۔ شاعروں کے ناموں میں چھپا ہوا ایک نام گیتانجلی کے شاعر "ٹیگور" پورا نام "رابندر ناتھ ٹیگور" ہے۔

۱۰۔ صحراؤں میں پوشیدہ ایک صحرا کا نام "سینا" ہے جسے وادیٔ سینا بھی کہتے ہیں۔

کراچی

صباحت حبیب، ماڈرن کالونی منگھوپیر
کمال احمد خان، لیاقت آباد
عبدالمتین خان، لیاقت آباد
ثوبیہ طلعت، فیڈرل بی ایریا
امبر بانو، گلشن اقبال
عالیہ رجاء انصاری، فیڈرل بی ایریا
عظمیٰ ادریس، رامسوامی
عنبرین محمد یوسف، بہار کالونی
سیف الحق، شاہ فیصل کالونی
افشین قریشی، شاہ فیصل کالونی
ہما فاروق، ناظم آباد
محمد افضل، بلدیہ ٹاؤن
اُمِّ کلثوم، شاہ فیصل کالونی
حاجی ابراہیم، بغدادی
محمد ساجد، شاہ فیصل کالونی
محمد مزمل شریف، ناظم آباد
محمد مدثر شریف، ناظم آباد
ثمرین شہزاد، ماڈرن کالونی منگھوپیر روڈ
عاکف عالم خان، ماڈرن کالونی منگھوپیر روڈ
سید محمد نسیم نقوی، نیپئر روڈ
نوشین گل، شوماکیٹ
مبین فاطمہ، کریم آباد
خدیجہ ظفر، دستگیر سوسائٹی
سعدیہ خانم، ماڈرن کالونی منگھوپیر روڈ
سید حسن جاوید، گلشن اقبال
سارہ جاوید زبیری، نارتھ کراچی
رضوان حامد زبیری گلشن اقبال
سید ذیشان عباس، گلشن اقبال
شاہین قریشی، شاہ فیصل کالونی
محمد صالح چنہ عرف پگارو، گولارچی، شیرداہ
نوید انور بھٹی، گوجرانوالہ
عظیم احمد عباسی، جھنگ صدر
علقمہ ملک، گوجرہ روڈ جھنگ صدر
حمید اسلیم خان، شورکوٹ
کنیل احمد، رحیم یار خاں
اظہار الحق، شاہ فیصل کالونی
کرن بانو، گلشن اقبال
واصف عباس، گلشن اقبال
طیبہ خانم، ماڈرن کالونی منگھوپیر روڈ
علی جاوید، گلشن اقبال
بینا غزل، شرف آباد
عبدالباسط، نارتھ کراچی
وردہ ظفر، دستگیر سوسائٹی
عامر ظفر، دستگیر سوسائٹی
سیما حسنین، کورنگی
شرزیدی، ماڈل کالونی
سیدہ عائشہ شبلی، نارتھ کراچی
خواجہ رضا مہدی، کورنگی
آصف ضیاء، بلدیہ ٹاؤن
نہال احمد خان، لیاقت آباد
کامران احمد خان، لیاقت آباد
مرزا فرخ بیگ، ایئرپورٹ
شاہد احمد، ناظم آباد
سید سلطان احمد، فیڈرل بی ایریا
عائشہ سحر علی، فیڈرل بی ایریا
خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال
مدوش صفدر، نارتھ ناظم آباد
صائمہ افتخار، ناظم آباد
رضا علی وکیل، عزیز آباد
محمد فیصل، میٹھادر
کاشف شمیم، آگرہ تاج کالونی
شارق شمیم، آگرہ تاج کالونی
کامران مجید، نئی کراچی

حیدرآباد

نعیم جمیل، رحیم یار خان

محمد انظر بلال ، چکوال
سمیعہ اقبال خانم ، چکوال
محمد آصف انظر ، چکوال
فیصل حیات ، چکوال
لیاقت علی خاں ، چکوال
انیقہ صدف ، شاہی بازار
راشد اشرف اعوان ، واپڈا کالونی
ارشاد محمد شیخ ، لطیف آباد
ضیاء الرحمٰن ، حالی نگر
شفیق الرحمان ، حالی نگر
فتحیہ صدیقی ، لطیف آباد
طاہر اشرف اعوان ، واپڈا کالونی
کاشف شکور ، مین سوسائٹی

حمیرا عظمیٰ ، مکتی گلی
فہد احمد ، ملتان
نادیہ جبیں ، راولپنڈی
محمد منیب اسلام ، اسلام آباد
محمد ارشد ، چارسدہ
محمد آفتاب ، چارسدہ
آصف میمن ، مہران یونیورسٹی جام شورو
محمد عاصم کیڈٹ ، محمد بن قاسم ہاؤس کیڈٹ کالج

لاہور

فیصل احمد عباسی ، وحدت کالونی
فیض احمد عباسی ، وحدت کالونی
رخشندہ ریاض ، باغبانپورہ
تابندہ ریاض ، باغبانپورہ
راحت اکرام ، ٹاؤن شپ
مس سلطانہ خلیل ، سمن آباد

متفرق شہر

افشاں پروین عباسی ، محمد عباسی شاہی بازار ٹھٹھہ
اخلاق احمد عباسی ، کیڈٹ کالج پٹارو دادو
شہلا صدیقی ، جناح روڈ ٹنڈو آدم
غلام رسول پارس ، ایم اے جناح روڈ سانگھڑ
محمد امین سیف اللوک ، حسینی منزل وارڈ ۸ سانگھڑ
ذوالفقار حیدر ، سنجھورو
ابوبکر القاسم ، گکھڑ منڈی
طیبہ سلطانہ ، بہاولپور
طارق مجید ، بہاولنگر

نام ..... جماعت .....
حاصل کردہ پوائنٹس ..... پتہ .....

عید ہماری اجتماعی خوشیوں کا نام بھی ہے اور
ہماری ملت کے لیے یکجہتی کا پیغام بھی

آنکھ مچولی

کی جانب سے آپ سب کو

عید مبارک

آئیے عہد کریں کہ ہم

- اپنی زندگی کو اللہ کی رضا اور اطاعت کے لیے وقف کر دیں گے۔
- ہر کلمہ گو کو اپنا بھائی سمجھیں گے خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتا ہو اور کہیں کا بھی رہنے والا ہو۔
- اپنے وطن کو امن اور محبت کا گہوارہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

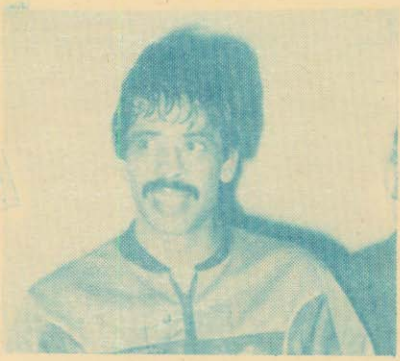

جہانگیر خان نے مسلسل آٹھویں مرتبہ برٹش اوپن اسکوائش چیمپئن شپ جیت کر جیف ھنٹ کا ریکارڈ برابر کر دیا۔

اس عظیم کامیابی پر ادارہ آنکھ مچولی اپنے ننھے قارئین سمیت جہانگیر خان کو مبارکباد اور خراجِ تحسین پیش کرتا ھے۔

خُدا کرے ایسی بہت سی کامیابیوں کے ذریعے وطن کی نیک نامی کا سفر جاری رہے۔

لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی!

احمد کھیر مکس

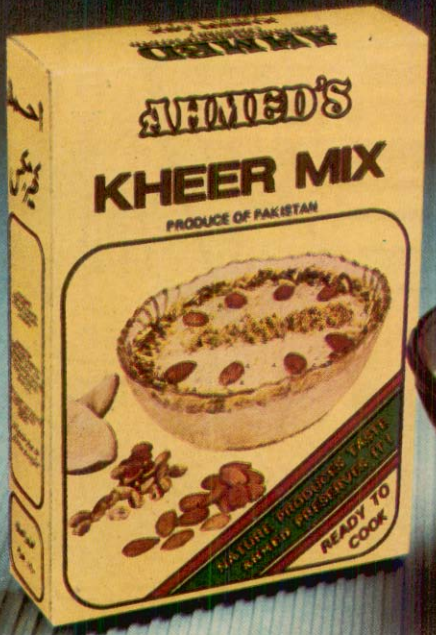

متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی

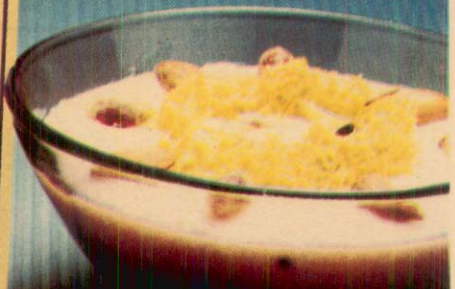

احمد کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت!

MASS

Scancraft

"جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم"

بالکل ایسے ہی

گرمیوں کی حدّت میں ٹھنڈے اور شیریں احساس

کا

ایک حسین نام

نورس

قومی مشروب

آپ عوامی پیک میں بھی دستیاب ہے

بھڑ اور شہد کی مکھّی

شکیل فاروقی

کسی بھڑ کو مکھی شہد کی مِلی کسی پھول پر مسکراتی ہوئی
کہا بھڑ نے "پیاری مرے پاس آ میں جو پوچھتی ہوں وہ مجھ کو بتا
میں ہوں خوبصورت و خوش رنگ بھی کہ پائے ہیں اچھے بہت انگ[1] بھی
کوئی اِس پہ بھی پیار کرتا نہیں محبّت کا اظہار کرتا نہیں
بتا لوگ تجھ پر ہی مرتے ہیں کیوں وہ تیری ہی تعریف کرتے ہیں کیوں"
جو ابا یہ مکھّی نے بھڑ سے کہا "مری بات کا مانیے مت بُرا !
ہے ایذا رسانی شعار آپ کا بُروں میں ہُوا بس شمار آپ کا
میں رہتی ہوں اپنی ہی دھُن میں مگن ہے محنت و خدمت ہی میرا چلن
اسی واسطے پیار کرتے ہیں لوگ محبت کا اظہار کرتے ہیں لوگ"

کسی کو نہ نقصان پہنچائیے
جہاں تک ہو اوروں کے کام آئیے

[1] اعضا

(ماخوذ)

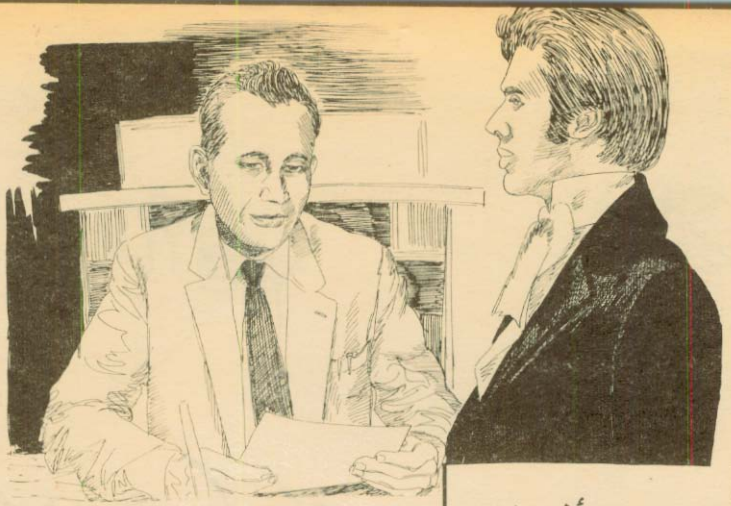

سلسلے وار سائنسی ناول

عکس

شاہنواز فاروقی

آخری قسط

۲۰۰۴ کا زمانہ ۔ سرمد ایک میوزیم میں منتظم کے عہدے پر فائز ہے ۔ سرمد کے بچپن کا دوست حارث پاکستان کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی ہے ۔ ایک دن سرمد حارث کے بلاوے پر کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے اسٹیڈیم گیا ۔ حارث نے اس میچ میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ بائیں ہاتھ سے بولنگ کر کے انگلستان کی ٹیم کو دونوں اننگز میں انتہائی کم اسکور پر آؤٹ کر دیا ۔ حارث کی ناقابلِ یقین حیرت انگیز بولنگ پر ہر شخص حیران رہ گیا ۔ میچ کے اختتام کے بعد حارث ایک نامعلوم کار میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا ۔ ایک ہفتہ تک کسی کو پتا نہ چلا کہ حارث کہاں ہے ... پھر حارث کی طرف سے ایک اخبار کو اطلاع ملی کہ وہ جب تک خود منظرِ عام پر نہ آ جائے اُسے تلاش نہ کیا جائے ۔ حارث کی اس پُراسرار گمشدگی نے پوری دُنیا کو حیران کر دیا تھا ۔ کچھ دنوں بعد حارث خود منظرِ عام پر آ گیا ۔ ایک دن سرمد کو اپنے ایک اور بچپن کے دوست فراز کا ٹیلی فون موصول ہُوا ۔ فراز سرمد سے فوراً ملنا چاہتا تھا ۔ فراز نے فون پر سرمد کو بتایا کہ وہ اس سے حارث کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے ۔ سرمد نے فراز کو رات کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کر لیا اور پھر فراز کی آمد کا انتظار کرنے لگا ۔ فراز مقررہ وقت پر سرمد کے گھر پہنچ گیا ۔ سرمد کو فراز کچھ بدلا بدلا سا لگا ۔ کھانا کھانے کے بعد ایک عجیب بات ہوئی فراز نے سرمد کے بیٹے بہزاد کی کتاب پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ۔ سرمد کو فراز کے اس رویّے پر حیرت ہوئی مگر اُس نے اظہار نہ کیا ۔ پھر وہ دونوں لائبریری میں آ بیٹھے ۔ لائبریری میں گفتگو کے آغاز پر فراز نے سرمد کو مہاتما بدھ کی ایک مورتی دکھائی ۔ ایسی ہی ایک مورتی سرمد کے میوزیم میں بھی موجود تھی ۔ سرمد کو حیرت ہوئی کہ یہ مورتی فراز کے پاس کہاں سے آئی ؟ سرمد نے مورتی کا معائنہ کیا تو وہ اصلی نکلی ۔ فراز نے وہ مورتی سرمد کو تحفے میں دے دی ۔ گفتگو کے دوران دو اور حیرت انگیز انکشافات ہوئے ، بچپن میں فراز کے بائیں ہاتھ پر جو دھبّہ تھا ۔ وہ اس کے دائیں ہاتھ پر آ گیا تھا اور اس کا دل بائیں کے بجائے دائیں جانب دھڑک رہا تھا ۔ سرمد کو شک ہوا کہ کہیں فراز گوشت پوست کا عکس تو نہیں !

اُس نے فراز کو آئینے کے سامنے کھڑا کیا تو اُس کا شک درُست ثابت ہُوا ۔ گھر آنے کے بعد فراز نے سرمد سے مورتی چُرانے کے حوالے

سے معذرت کی۔ سرمد نے جب فراز سے پوچھا کہ حارث اُس کے قبضے میں کیسے آگیا تھا تو اُس نے بتایا کہ وہ اپنے آخری ٹیسٹ میں کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دینا چاہتا تھا' سو میں نے اُسے بے ہوش کر کے عکس میں تبدیل کر دیا۔ جس کے بعد حارث نے کرکٹ کے میدان میں حیرت بولنگ کا مظاہرہ کیا۔ سرمد نے فراز کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس غیر معمولی تحقیقی کام کو چھپوا دے تاکہ اُسے نوبل پرائز مل سکے۔ مگر فراز نے اُس کا مشورہ ٹھکرا دیا اور کہا کہ وہ قدیم نوعیت کی چیزوں کو عکس میں تبدیل کر کے اُن کا وسیع پیمانے پر کاروبار کرنا چاہتا ہے یہ سُن کر سرمد کو حیرت ہوئی۔ سرمد کو معلوم نہیں تھا کہ فراز کے اس بدلے ہوئے رویّے کے اسباب کیا ہیں۔ فراز نے سرمد کو اپنی کہانی سُنائی اس کے والدین کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس کا باپ بیرونِ کا نشہ کرتا تھا۔ ماں سلائی کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ ایک دن اُس کے باپ کا حادثے میں انتقال ہوگیا۔ اس کے چھ ماہ بعد فراز کی ماں بھی چل بسی۔ فراز نے ٹیوشن سینٹر کھول لیا۔ ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی پھر اُس نے انکشاف کیا کہ اُس کی بہن عظمت مرکزِ اصلاح میں ہے' کیونکہ اُس نے بھاری جہیز کے مطالبے پر غصّے میں آکر اپنے منگیتر کے مُنہ پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ جبکہ اُس کا چھوٹا بھائی ندیم پاگل خانے میں ہے۔ یہ سُن کر سرمد حیران رہ گیا۔ فراز نے سرمد کو اپنے چھوٹے بھائی ندیم کے پاگل ہو جانے اور اپنے دولت کمانے کی جانب راغب ہونے کی وجوہات نیز اپنے بُرے دفتری ماحول کے بارے میں بتایا۔ فراز کے تمام حالات جاننے کے باوجود سرمد فراز کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار نہ ہُوا۔ چنانچہ فراز سرمد کے گھر سے چلا گیا۔ دو روز بعد فراز سرمد کی بہن عظمت کے پاس گیا تاکہ سرمد کو راہِ راست پر لایا جا سکے۔ اگلے روز فراز نے اخبار میں ڈیفنس لیبارٹری کے ریسرچ آفیسر نسیم کے اغوا کی خبر پڑھی۔ سرمد کو فراز پر شک ہُوا۔ تھوڑی دیر بعد فراز دوبارہ سرمد کے گھر آ پہنچا۔ اُس نے سرمد کو بتایا کہ نسیم کو اُسی نے اغوا کر کے ایٹمی سرچشمے میں نہلایا۔ جس کے باعث نسیم اپنی یادداشت سے محروم ہو گیا ہے۔ فراز نے سرمد کو بتایا کہ اس وقت نسیم شہر کے باہر زیرِ تعمیر فلیٹوں کے پاس بے ہوش حالت میں پڑا ہے۔ اس کے بعد کہانی تیزی کے ساتھ کس طرح اختتام کو پہنچی آخری قسط میں ملاحظہ کیجئے۔

فراز کے چہرے پر اس وقت نفرت، حقارت یا غصّے کا کوئی تاثر نہیں تھا وہ مکمل طور پر پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

"مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے غصّے سے پوچھا۔

"یار کہا تو ہے... بس... یونہی"

"تم بکتے ہو"

"سب ہی بکتے ہیں... کبھی نہ کبھی" فراز نارمل انداز میں بولا۔

"اچھا تمہاری مرضی' نہ بتاؤ" میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ فراز نے مجھے جھنجھلاتے دیکھا تو بولا۔

"جھنجھلاؤ مت سرمد... اس سے صحت خراب ہو جاتی ہے اور تم ایک شریف آدمی ہو۔ تمہاری صحت خراب ہوگئی تو تمہارے خاندان کا کیا بنے گا"؟

فراز نے استادانہ انداز میں کہا۔ میں نے اُس کے جملے میں چھپے طنز کو پوری طرح محسوس کیا۔

"خیر...! یہ بتاؤ کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"صرف یہ بتانے کہ وہ شخص بے ہوش حالت میں کس جگہ پڑا ہے... ویسے اگر تم اپنے گھر سے فون کر کے

پولیس کو اس کے بارے میں اطلاع دے دو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"اور کچھ؟" میں نے کہا۔

"ہاں! میں آخری بار تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ تم میرے منصوبے میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

"نہیں... اب تو بالکل بھی نہیں!" میں نے تیز آواز میں کہا۔

"کیوں... اب کیا ہوا؟" فراز نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے اندر کا انسان مکمل طور پر مر چکا ہے۔ اب تم درندگی پر اتر آئے ہو۔ جن لوگوں کو تم اپنی اس حالت کا ذمے دار قرار دیتے ہو... اب اُن میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ اب تم بھی ظالموں کی صف میں شامل ہو، اب تم مظلوم نہیں ہو۔ تم نے ایک انسان کو نارمل زندگی سے محروم کر دیا ہے۔" میں بے تکان بولتا چلا گیا۔

"اچھا... بس کرو... شریف آدمی۔" فراز صوفے پر سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

اسی لمحے یکایک میرے ذہن میں فراز کی وہ گفتگو اپنی تفصیلات کے ساتھ تازہ ہوگئی جو فراز نے اس سے پہلے میرے یہاں آکر مجھ سے کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ فراز نے آفس کے ساتھیوں میں ایک ساتھی کے بارے میں کہا تھا کہ وہ اُس کا جینا حرام کیے رہتا ہے۔ کہیں اغوا کیا جانے والا لڑکا وہی تو نہیں؟ مجھے اس ماحول میں اُس گفتگو کے یکایک یاد آجانے پر انتہائی حیرت ہوئی۔

"کہیں یہ لڑکا وہی تو نہیں جو تمہیں دفتر میں ہر روز پریشان کیا کرتا تھا۔" میں نے فراز سے اچانک سوال کیا۔ میرے اس اچانک استفسار پر فراز چونک پڑا۔ لیکن اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو نارمل کر لیا۔

"ہاں... یہ وہی رُستم صاحب ہیں۔" فراز نے حقارت سے کہا۔

"تم نے انتقام لیا ہے اُس سے؟"

"مجھے نہیں معلوم... میں نے تو اُسے اپنے تجربے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب اگر وہ اپنی یادداشت سے محروم ہوگیا ہے تو اُس میں میرا کیا قصور؟"

"یعنی... یعنی، تمہارا کوئی قصور ہی نہیں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں اس تجربے کی بدولت اپنے تحقیقی کام کی تکمیل کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ اس تجربے کے ذریعے مجھے بہت سی ضروری باتیں معلوم ہوگئی ہیں۔"

فراز کا مدھم لہجہ اور جھکی ہوئی نظریں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اُس نے لڑکے کو انتقامی جذبے کے تحت ہی اغوا کیا تھا۔

"اگر میں پولیس کو اطلاع کر دوں تو!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے! تم یہ بھی نہیں کر سکتے... تم تو اتنے شریف آدمی ہو" فراز نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ تمہاری بھول ہے، میں ایسا کر سکتا ہوں" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"تو پھر کرو۔ دیر کس لیے کر رہے ہو" ویسے تمہارے پاس میرے جرم کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ نسیم کے اغوا کی رپورٹ بھی میں نے خود تھانے میں درج کرائی ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے متعلق ایسی خبر پر کوئی یقین نہیں کرے گا" فراز نے ایک شانِ بے نیازی سے کہا مجھے اندازہ تھا کہ فراز نے یہ کام کس چالاکی سے کیا ہوگا۔

فراز کو معلوم تھا کہ میں واقعی ایسا نہیں کر سکتا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں اُس سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ پھر اُس کے حالات سُننے کے بعد میں نے جس طرح اُس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ میں فراز کے ساتھ اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔

"میں ابھی چند روز قبل عظمت سے ملنے کے لیے جیل گیا تھا" میری بات سُنتے ہی فراز بُری طرح چونک پڑا۔

"تم... تم جیل گئے تھے"

"ہاں"

"کس لیے؟"

"تمہارے بارے میں بات کرنے" میں نے آرام کے ساتھ کہا۔ اس حقیقت کے انکشاف سے فراز نہ جانے کیوں بوکھلا گیا۔

"عظمت کا خیال بھی یہی ہے کہ تم اپنے حالات کو بھول کر زندگی کو پُرسکون طریقے سے بسر کرو۔ تم پرسوں جمعے کو اُس سے ملنے جاؤ گے تو وہ تم سے بات کرے گی"

"اچھا! وہ مجھ سے بات کرے گی... کیا بات کرے گی۔ اُسے معلوم ہے مجھے میرے ارادے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ وہ بھی نہیں۔ پھر وہ بھلا کیا بات کرے گی بے وقوف۔ ہونہہ" فراز نے گردن

ہلائی، کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔

"بہرحال جیسا تم مناسب سمجھو" میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"شکریہ سر مدصاحب! میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے ... انشاءاللہ پھر ملاقات ہوگی" فراز نے یہ کہہ کر دروازے کا رُخ کیا۔

"پھر کب ملاقات ہوگی؟" میں نے ہچکچاتے ہوتے پوچھا

"ملاقات! معلوم نہیں" فراز نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔

فراز کے جاتے ہی میں نے پولیس کو فون کرے اغوا ہونے والے لڑکے کے متعلق اطلاع دی اور دفتر کے لیے نکل کھڑا ہوا

گھر سے نکلتے وقت ریشماں نے فراز کے یوں اچانک آنے کے بارے میں مجھ سے پوچھا مگر میں بات گول کر گیا۔

دفتر میں سارا دن مجھے فراز کے متعلق خیالات آتے رہے، شام کو دفتر سے واپسی پر میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی ٹی وی آن کر دیا۔ اُس وقت شام کی خبریں آرہی تھیں۔ اس وقت کے ہیلیٹن کی آخری خبر ڈیفنس لیبارٹری کے ریسرچ آفیسر نسیم کے اغوا سے متعلق تھی۔ جس کے مطابق اغوا ہونے والے لڑکے کو پولیس نے برآمد کر کے اسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔ لیکن اغوا کرنے والے کو ابھی تک گرفتار نہیں کیا جا سکا تھا۔ معاملہ چونکہ ڈیفنس لیبارٹری کے ریسرچ آفیسر کا تھا۔ اس لیے ملک کے اعلیٰ حکام نے اس واقعے کی فوری تحقیقات کا حکم دے دیا تھا۔

کار چلاتے چلاتے یکایک میرا دل گھبرانے لگا۔ رفتہ رفتہ میرا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اس اچانک گھبراہٹ کے طاری ہو جانے پر مجھے حیرت ہو رہی تھی کیونکہ میں جسمانی طور بالکل نارمل تھا... یکایک میرا دل چاہا کہ میں ابھی اسی وقت فراز سے ملوں۔ مگر وہ کہاں ہوگا مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔ فراز اب تک کئی بار میرے گھر آچکا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اُس سے اُس کے مکان کا پتہ معلوم نہیں کیا۔ نہ ہی اُس نے خود کبھی بتایا۔ گھبراہٹ کے اسی عالم میں میں گھر پہنچا اور حتی الامکان خود کو نارمل بنائے رکھا تاکہ ریشماں کو پریشانی نہ ہو۔

رات کو جلد ہی کھانا کھا کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ خلافِ معمول مجھے لیٹتے ہی نیند آگئی۔ میں رات بھر گہری نیند سوتا رہا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے۔ ریشماں کچن میں تھی اور بہزاد ابھی سویا

ہوا تھا۔ میں نے بستر سے اُٹھ کر کھانے کی ٹیبل پر رکھا ہوا اخبار اُٹھایا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے مجھے کسی اہم خبر کی تلاش ہو۔ لیکن صفحۂ اوّل پر ایسی کوئی خبر موجود نہ تھی۔ میں نے جلدی جلدی سارا اخبار دیکھ ڈالا۔ ریشماں نے مجھے جلدی جلدی اخبار کے صفحے پلٹتے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا کوئی خاص خبر ہے؟"

"نہیں" میں نے چونکے بغیر جواب دیا۔

"پھر اخبار کو یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟" اُس نے چائے کا ایک کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بس یونہی"

ریشماں نے میری جانب بے یقینی کی نظر سے دیکھا مگر اور کوئی سوال نہ کیا۔

یکایک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے تقریباً دوڑتے ہوئے ریسیور اُٹھایا۔ اور اُسی لمحے فون کے ساتھ نصب ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھا مگر اُس پر کوئی تصویر نمودار نہ ہوئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ فون دس میل سے زیادہ دُور سے آیا تھا۔

"ہیلو--- آپ مسٹر سرمد ہیں نا؟"

"جی ہاں --- آپ کون صاحب ---؟"

"میں ڈیفنس لیبارٹری کا ڈائریکٹر ایس اے رحمٰن بول رہا ہوں"

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"جی فرمائیے"

"آپ فراز صاحب کو جانتے ہیں؟" سوال کیا گیا۔

"جی ہاں --- وہ میرا دوست ہے" مجھے لگا میرے جسم کا خون سمٹ کر یکایک میرے دماغ میں اکٹھا ہو گیا ہے۔

"دراصل بات یہ ہے کہ فراز صاحب کل رات لیبارٹری میں ہونے والے ایک دھماکے میں شدید زخمی ہو گئے ہیں۔ کیا آپ فوراً ایچ بی اسپتال پہنچ سکتے ہیں؟"

"فراز ٹھیک --- اچھا میں فوراً پہنچ رہا ہوں" میں نے تقریباً ہانپتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے ریسیور رکھا اور رات کے کپڑوں ہی میں ایچ بی اسپتال جا پہنچا۔ اسپتال کے دروازے پر ہی ایک شخص جس کی عمر اندازاً پچاس برس ہو گی میرا منتظر تھا۔

"کیا آپ ہی سرمد ہیں؟"

"جی ہاں ...!"

"میں ایس اے رحمٰن ہوں، آئیے میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اسپتال کے ایک پرائیویٹ کمرے میں لے گئے۔ فراز بستر پر بے ہوش پڑا تھا اُس کا پورا جسم صحیح سلامت تھا۔ کہیں کسی چوٹ کا نشان نہیں تھا۔ قریب جاکر دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ اُس کا دایاں ہاتھ اور دائیں ٹانگ دائیں جانب کو مُڑے ہُوئے ہیں۔

"یہ ٹھیک تو ہو جائے گا رحمٰن صاحب؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ان کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں البتہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ حادثے کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ان کا ذہنی توازن مکمل طور پر بگڑ چکا ہے، بلکہ یہ اپنی یادداشت بھی مکمل طور پر کھو چکے ہیں۔"

"اُف خُدایا!"

"ہمت سے کام لیجیے سرمد صاحب۔" رحمٰن صاحب نے مجھے سنبھالتے ہوئے کہا

آئیے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" یہ کہہ کر رحمٰن صاحب مجھے لے کر اسپتال کے لان میں پہنچے

اس وقت اسپتال بالکل خالی تھا

"آپ فراز کو کب سے جانتے ہیں؟" رحمٰن صاحب نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"بچپن سے۔" میرا مختصر جواب تھا۔

اس کے بعد میں نے بچپن سے لے کر اب تک کے رُونما ہونے والے اُن تمام واقعات سے رحمٰن صاحب کو آگاہ کیا جو فراز کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔

رحمٰن صاحب میری باتیں توجہ اور حیرانی کے ساتھ سُنتے رہے۔ اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ فراز ایمی تجربہ گاہ میں رہتے ہوئے اب تک کیا کام کرتا رہا ہے؟ میں نے جب اُنہیں بتایا کہ فراز انسان کو عکس میں تبدیل کرنے کا حیرت انگیز تجربہ کامیابی کے ساتھ مکمل کر چکا ہے تو وہ حیرت اور خوشی کے مارے تقریباً اُچھل پڑے۔

"اس ایجاد پر تو فراز کو نوبل انعام مل سکتا ہے!" رحمٰن صاحب نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

"جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے ... مگر اب فراز کو یہ انعام کیسے مِل سکتا ہے؟" میں نے رنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"کیوں؟" رحمٰن صاحب میرے جُملے کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔

"میرا مطلب ہے کہ فراز تو اب زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہے۔"

"اوہ! ہاں ... یہ تو ہے ..." رحمٰن صاحب ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

"خیر چھوڑیے ... آپ کے نام فراز کا یہ ایک خط ہے۔ حادثے کے بعد اُس کی جیب سے ایک پرچی ملی تھی، جس پر لکھا ہُوا تھا کہ اُس کی دراز میں رکھا ہُوا لفافہ آپ تک پہنچا دیا جائے"۔ میں نے تقریباً جھپٹتے ہوئے رحمٰن صاحب کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔ اور اُسے کھول کر بے تابی کے ساتھ اُس میں موجود خط پڑھنے لگا۔ خط کی عبارت یہ تھی۔

پیارے سرمد!

یہ خط میں تمہیں تجربہ گاہ میں جانے سے ایک گھنٹہ قبل لکھ رہا ہوں۔ میرا تجربہ آج آخری مرحلہ بھی طے کر لے گا۔ تجربے کا یہ آخری مرحلہ انتہائی پیچیدہ ہے، مجھے اس تجربے کے لیے درکار ضروری آلات نہیں مل سکے اس لیے تجربے کے دوران حادثے کا اندیشہ ہے، ممکن ہے یہ مرحلہ میری جان ہی لے لے ... تمہارے نام یہ خط میں اسی خدشے کے پیشِ نظر لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے کہ حادثے کی صورت میں یہ خط تم تک پہنچ جائے۔

سرمد تم میرے بچپن کے دوست ہو، اور نہ صرف یہ بلکہ تم دنیا کے ... شاید وہ واحد شخص ہو جسے میرے حالات سے اچھی طرح واقفیت ہے۔ (ممکن ہے تم نے عظمت کو بھی کچھ بتا دیا ہو) اس لیے مجھے تم سے امید ہے کہ تم میری آخری خواہشات کو ضرور پورا کرو گے۔ اگر میں حادثے کا شکار ہو گیا تو عظمت اس دُنیا میں بالکل تنہا رہ جائے گی۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ میرے بعد تم اُسے اپنے گھر لے آنا اور جتنی جلدی ہو اُس کی شادی کر دینا۔ ندیم پاگل خانے میں ہے اُسے کبھی کبھی دیکھنے چلے جایا کرنا۔ اگر میرے کام پر مجھے نوبل انعام دیا گیا (جیسا کہ تمہیں توقع ہے) تو انعام کی ۲۰ فیصد رقم عظمت کے نام بینک میں جمع کرا دینا اور باقی رقم کینسر کے مریضوں کے علاج اور اُن لڑکیوں کی شادیوں کے لیے وقف کر دینا جو جہیز نہ ہونے کے باعث گھر میں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ تمہیں شاید تعجب ہو رہا ہو کہ مجھ جیسا سنگ دِل انسان ایسے نیک کاموں میں اپنے پیسے کو لگا دینے کی بات کیسے کر رہا ہے؟ تمہیں تعجب ہونا ہی چاہیے! مگر تمہیں کیا معلوم کہ تم مجھے جیسا آدمی سمجھتے ہو میں ویسا ہرگز نہیں ہوں۔ میرے سینے میں ابھی تک انسانوں کی محبت اور کومل جذبات سے بھرا دِل دھڑکتا ہے۔ مگر میرے حالات نے میرے اندر اتنا زہر بھر دیا ہے کہ انسانی محبت کے جذبات زیادہ دیر تک میرے ساتھ نہیں رہ پاتے۔ لیکن اگر میں مر گیا تو پھر میرے غیر انسانی جذبات کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ اور پھر انعام کی رقم میرے کس کام کی ہوگی؟ کاش تم میری بات مان لیتے یا کاش میں ہی تمہاری بات مان جاتا! خیر! اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو میں کچھ دیر بعد موت اور

زندگی کے گلے میں باہنیں ڈال کر چلنے والا ہوں۔

میں نے اس تجربے کی اب تک کی تمام تفصیلات ٹائپ کر کے یو سی بی بینک کے لاکر نمبر ۲۱ میں رکھوادی ہیں۔ میں تمہیں ان کاغذات کو نکلوانے کا اختیار دیتا ہوں۔

شہزادے! اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ عظمت اور ندیم کا جس طرح میں نے کہا ہے خیال رکھنا۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اچھا دوست خدا حافظ! اگر زندہ رہے تو پھر ملاقات ہوگی... ورنہ۔

فقط تمہارا دوست فراز

۱۲ اگست ۲۰۰۵ء

آج میں بہت خوش اور بہت رنجیدہ ہوں۔ خوش اس لیے کہ آج فراز کو طبیعات کے میدان میں غیر معمولی تحقیقی کام انجام دینے پر نوبل انعام دیا گیا اور رنجیدہ اس لیے کہ فراز اس بات سے بالکل بے خبر ہے۔ فراز کی جانب سے انعام اُس کی بہن عظمت نے وصول کیا۔ ساری دنیا کے اخبارات میں فراز کے متعلق بڑی بڑی خبریں اور فیچر شائع ہو رہے ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے اور مشہور ٹی وی اسٹیشنوں سے فراز کی زندگی اور کارنامے پر دستاویزی فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے اپنے اس لائق سائنس دان کو ملک کا اعلیٰ ترین سول اعزاز اور دس لاکھ روپے کی نقد رقم دینے کا اعلان کیا ہے۔ طبیعات کی دنیا کے بڑے نام فراز کی ایجاد کو آئن اسٹائن کی ایجاد سے زیادہ اہم قرار دے رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ فراز کے فارمولے کے استعمال کی بدولت دنیا ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوگی۔ جس کا آج تک کسی نے تصور بھی نہیں کیا۔ اُن کا کہنا ہے کہ فراز کے فارمولے پر عمل کر کے انسانی جسم کو اتنا مضبوط بنایا جا سکے گا کہ اُس پر کسی قسم کی گولی اثر نہیں کرے گی اور نہ صرف یہ بلکہ انسانی جسم آگ سے جلنے سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ جنگی ماہرین کا خیال ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر اس زمین پر آمنے سامنے ہو کر لڑی جانے والی جنگ بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

افسوس! فراز اپنے اس کارنامے کی اہمیت سے بے خبر دماغی امراض کے اسپتال کے ایک کمرے میں آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہا ہے۔ اُسے نہیں معلوم کہ اس وقت دن ہے یا رات، گرمی ہے یا سردی وہ آدمی ہے یا کچھ اور۔ اُس کی بہن عظمت اس وقت اُس کے سرہانے بیٹھی ہے۔ اس وقت بھی اخبارات کے کئی فوٹو گرافر فراز کی تصاویر اُتار رہے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ فراز دُنیا کے لیے نشانِ عظمت ہے یا نشانِ عبرت؟

وہ ایک تقریب

محمد جاوید خالد

"کیوں بھئی قریشی صاحب ہیں؟" ظفر صاحب نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی مالی سے پوچھا جو صحن میں پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ قریشی صاحب تولیہ چہرے پر رگڑتے اندر سے نمودار ہوئے۔

"ہاں بھئی میں ہوں" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر یہ کیا حرکت ہے۔ اندر آؤ گے بھی یا ساری معلومات وہیں سے کرو گے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے" وہ بھی جواب میں مسکرا دیئے۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی انہوں نے کھلے دروازے سے اندر بڑھا دی۔

"تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو" اندر پہنچتے ہی قریشی صاحب نے پوچھا

"ہاں یار!! میں واقعی پریشان ہوں" ظفر صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی، قریشی صاحب سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔ ملازم چائے رکھ کر چلا گیا تو ظفر صاحب نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"تم جانتے ہو" انہوں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: "میں نے ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری ہے اور اللہ کا بڑا کرم ہے کہ کالج کی ذمے داری مجھے سونپی گئی اس کے نتائج ہمیشہ ہی اچھے رہے۔ اب ریٹائرمنٹ میں بھی دو تین برس باقی رہ گئے ہیں، سروس کے آخری ایام میں میری نیک نامی خاک میں ملتی نظر آرہی ہے۔"

"وہ کیسے؟" قریشی صاحب چونکے

"وہ اس طرح کہ پچھلے دنوں میرا تبادلہ بحیثیت پرنسپل مسلم ملّی کالج کر دیا گیا۔ یہ کالج تعلیمی اداروں میں بہت بدنام ہے۔ شہر کے آوارہ اور بدقماش لڑکے یہاں جمع ہوتے ہیں۔ پڑھتے لکھتے خاک نہیں ہیں۔ سال بھر دنگا فساد کرتے رہتے ہیں اور ہر امتحان میں کامیابی کے لیے غیر قانونی اور اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ طلبا اپنی ذمے داریاں سمجھیں، مگر میری ساری کوششیں بے کار گئیں۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ میری مخلصانہ کوششوں کا صلہ مجھے اس طرح ملا ہے کہ مجھے ٹیلی فون پر برا بھلا کہا جاتا ہے بلکہ اب تو دھمکیاں دی جانے لگی ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں؟ تبادلے کے لیے درخواست دوں تو یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ طلبا کو نقل کے ذرائع اختیار کرنے دوں تو یہ صرف بددیانتی ہے بلکہ خود طلبا کے ساتھ، وہ اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں، کھلی دشمنی ہے اور چونکہ پڑھائی کی طرف ان کی طبیعت آتی نہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ رزلٹ اس قدر خراب آئے گا کہ میرا سارا پچھلا ریکارڈ خراب ہو جائے گا۔"

"امتحان میں کتنے روز باقی ہیں؟" کچھ دیر کے بعد قریشی صاحب نے پوچھا۔

"امتحان میں صرف دو مہینے باقی ہیں۔" ظفر صاحب نے جواب دیا۔

"خاصا وقت ہے پھر تو۔" قریشی صاحب نے کہا۔

"خاصا وقت تو اُس کے لیے ہے جو پڑھنا چاہتا ہو۔ پڑھنے والا تو ایک مہینے میں بھی بہت کچھ کرے گا۔ مگر یہاں مسئلہ یہی ہے کہ لڑکوں کے پاس وقت بہت ہے لیکن پڑھنے کے لیے نہیں۔ زمانے بھر کے اللے تللے کر لیں گے گھنٹوں آوارہ گردی میں گزار دیں گے مگر نہیں دیکھیں گے تو کتابوں کی طرف نہیں دیکھیں گے۔ قریشی صاحب!! آپ کو حیرت ہوگی یہ جان کر کہ پہلے لڑکے نقل کے پرچے تیار کرنے میں کچھ نہ کچھ وقت صرف کرتے تھے۔ مگر اب وہ بھی انہیں بنے بنائے اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں کی شکل میں دستیاب ہو جاتے ہیں۔ چند ٹکوں کے لالچی لوگ نئی نسل کا خون کرنے پر تلے ہوئے ہیں انہیں جہالت کے تاریک غاروں میں دھکیل رہا ہے۔" شدتِ جذبات سے ظفر صاحب کی آواز بھرا گئی تھی۔ قریشی صاحب بُت بنے بیٹھے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالیں۔

"مجھ سے کوئی کام تو نہیں تھا تمھیں۔" قریشی صاحب نے کچھ دیر کے بعد سوال کیا۔

"ارے ہاں یار!! میں باتوں میں بھول ہی گیا" ظفر صاحب نے کہا "کام یہ ہے کہ اگلے ہفتے کالج میں ایک سیمینار ہے تمہیں اس کی صدارت کرنی ہے"

قریشی صاحب محکمۂ تعلیم کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے وہ نہ صرف ممتاز ماہر تعلیم تھے بلکہ اپنی علم دوستی کی وجہ سے علمی حلقوں میں بے حد مقبول بھی تھے۔ ظفر صاحب سے ان کی پرانی دوستی تھی اور چونکہ دونوں ذی علم تھے اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ ظفر صاحب نے جب انہیں سیمینار کی دعوت دی تو فوراً ہی اُن کے ذہن میں ایک خیال آیا اور انہوں نے ظفر صاحب کی دعوت منظور کر لی۔

سیمینار ہوا اور بہت کامیاب رہا۔ آخر میں قریشی صاحب کو صدارتی تقریر کرنی تھی۔ وہ بڑے وقار سے اُٹھے اور مائیک کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"میرے نوجوان دوستو!" انہوں نے کہنا شروع کیا "آپ کے پرنسپل صاحب کی خواہش پر میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔ عموماً ایسے مواقع پر تقریب کی صدارت کرنے والے طلبا کو نصیحتیں کرتے ہیں، انہیں کچھ علمی باتیں بتاتے ہیں لیکن میں یہ دونوں باتیں نہیں کروں گا۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ آپ لوگوں کو ایک سچا واقعہ سناؤں گا۔ ایک ایسا سچا واقعہ جو خود میرے اوپر اس وقت بیتا جب میری عمر آپ لوگوں کی طرح لاابالی سی تھی اور کوئی فائدہ یا نقصان کی بات مجھ پر اثر نہ کرتی تھی"

قریشی صاحب کی اس تمہید سے طلبا جو خشک تقریریں سُن سُن کر بور ہو گئے تھے ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

قریشی صاحب نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے والدین کو مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اور وہ مجھ میں اپنا مستقبل دیکھا کرتے تھے مگر بُرا ہو میری بُری سوسائٹی کا جس کی وجہ سے میں دن بہ دن آوارہ ہوتا چلا گیا۔ میرے والدین کے خواب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔ گھر سے کالج کے لیے نکلتا اور بگڑے ہوئے ساتھیوں کی صحبت میں جا بیٹھتا۔ رات گئے گھر میں داخل ہوتا۔ والد صاحب جلتے کڑھتے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ چھوٹا ہوتا تو مار پٹائی بھی ہو جاتی مگر اب وہ شاید میرے بڑے ہونے کا خیال کر جاتے لیکن مجھ پر کوئی بات اثر نہ کرتی تھی۔ ان کی ساری باتیں میں ایک کان سے سُنتا اور دوسرے سے اُڑا دیتا۔ امتحان آ گئے میرے سارے پرچے اچھے ہوئے۔ اچھے میں یوں کہہ رہا ہوں کہ مجھے نقل کرنے کے پورے پورے مواقع حاصل تھے، مگر جانے کیا ہوا کہ نتیجہ نکلا تو میں بُری طرح فیل ہو گیا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ کاپیاں جانچنے والے بے وقوف تو نہیں ہوتے وہ یقیناً سمجھ جاتے ہوں گے کہ کس طالب علم نے کون سا سوال کیسے کیا ہے؟ خیر، ہمارے اکثر دوستوں کا نتیجہ ایک ہی جیسا رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے جی بھر کر امتحان لینے والوں کو اور کاپیاں جانچنے والوں کو بُرا بھلا کہا بلکہ یہ پروگرام طے پایا کہ کاپیاں جانچنے والوں کا کھوج لگایا جائے۔

اور انہیں اس خراب نتیجے کی سزا دی جائے۔

اس شام جب میں گھر پہنچا تو میرا نتیجہ مجھ سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ والد صاحب مجھے خوب سرزنش کریں گے اور سخت سزا دیں گے مگر میرے خیال کے بالکل برعکس انھوں نے مجھ سے ایک لفظ نہ کہا۔ میں نے جا کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان سے آنکھیں چار کرتے ہی میرے دل کو ایک زبردست دھچکا سا لگا۔ ان کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے وہ روتے رہے ہوں۔ مجھے سخت ندامت محسوس ہوئی میں فوراً ہی ان کے کمرے سے نکل آیا۔ باہر نکلا تو رفیق چچا آئے ہوئے تھے۔ رفیق چچا رشتے میں نہ صرف میرے ابا کے بھائی لگتے تھے۔ بلکہ ان کے بچپن کے دوست بھی تھے۔ اور دونوں کی دوستی کا رشتہ پاکستان بننے سے پہلے سے قائم تھا۔ میرے نتیجے کی انھیں بھی خبر ہو چکی تھی، لیکن اس روز سب کچھ میری امیدوں کے خلاف ہو رہا تھا۔ رفیق چچا نے بھی میری پڑھائی امتحان یا نتیجے کے متعلق کچھ نہ کہا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔"

قریشی صاحب کچھ دیر پانی پینے کے لیے رُکے۔ ہال میں اس قدر خاموشی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ قریشی صاحب کی آواز پھر اُبھری "ادھر ادھر کی باتیں کرتے رفیق چچا ہمارے کالج کی طرف آ گئے۔ پوچھنے لگے "اس سال کالج یونین الیکشن میں تمھارے کتنے ساتھی کامیاب ہوئے؟" میں نے کہا صرف ایک دراصل چچا جان میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا الیکشن کے لیے صحیح جدّوجہد نہیں ہوئی، کوئی پُراثر مہم نہیں چلائی گئی۔" رفیق چچا یہ سُن کر بولے۔ "میاں برخوردار، الیکشن کے لیے جو جدّوجہد ہم نے کر لی اور جو مہم ہم نے چلالی۔ آنے والا کوئی دوراس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔" "آپ نے چچا جان؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ہاں بھئی ہم نے!!"

انہوں نے جواب دیا۔ "یہ پاکستان بننے سے ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ امتحانوں میں تھوڑا ہی عرصہ رہ گیا تھا اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے خیال سے لڑکے خوب محنت کر رہے تھے کہ ہمارے کانوں میں ایک آواز پہنچی۔ قائداعظمؒ کی آواز۔ ان کا پیغام آناً فاناً پورے کالج میں پھیل گیا۔ پیغام یہ تھا کہ مسلمان طلبا قوم کے مستقبل پر اپنے مستقبل کو قربان کر دیں اور ہونے والے الیکشن کے لیے گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں جائیں اور سب مسلمانوں کو سمجھائیں کہ پاکستان کے حق میں ووٹ دیں۔ آزادی کی اہمیت، غلامی کی لعنت اور ووٹ کی قوت ہر مسلمان کے علم میں ہونی چاہیے۔ کالج کے سارے مسلمان لڑکے بہت پُرجوش تھے۔ ہم لوگ گھروں کو گئے اور اس کے بعد گروپوں کی شکل میں قریہ قریہ پھیل گئے۔ بہت کم وقت میں ہم نے تمام علاقوں کا دورہ کر لیا۔ اب مسئلہ شہر کے پار پھیلے ہوئے دُور دراز دیہاتوں کا تھا۔ ہمارے گروپ میں دو لڑکے بہت جوشیلے تھے ایک میں تھا اور دوسرا میرا ایک دوست۔ میرا یہ دوست مجھ سے بھی زیادہ مستعد اور پاکستان کے حصول کے لیے بیتاب تھا۔ دوسرے ساتھیوں کو کشمکش میں دیکھا تو ہم دونوں ہی چپکے سے نکل کھڑے ہوئے۔ جیب میں تھوڑے سے پیسے

تھے اس کے ہم نے چنے خرید لیے۔ جہاں کچھ کھانے کو نہ ملتا چنے کھاتے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچاتے، ہم لوگ چلتے رہے۔ وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتا جب وقت بچانے کے لالچ میں ہم ایک گاؤں سے شام کے وقت یہ سوچ کر کھڑے ہوئے کہ رات زیادہ ہونے سے پہلے ہم دوسرے گاؤں پہنچ جائیں گے۔ دوسرا گاؤں ہمارے خیال سے دور نکلا ایسے میں ہمیں ایک کھلے میدان میں رات گزارنی پڑی۔ سردیوں کے دن تھے۔ تھوڑی سی دیر میں میرے دانت بجنے لگے۔ جانے تھکن کا اثر تھا کہ بے آرامی تھی مجھ پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ میرا ساتھی ذرا نہ ہراساں ہوا۔ اس نے مجھے تسلی دی۔ خشک لکڑیاں اکٹھی کیں۔ انھیں جلایا اور ساتھ ہی اپنی شیروانی اتار کر مجھ پہ ڈال دی۔ میری کچھ جان میں جان آئی تو گزرے دن یاد آنے لگے۔ گھر کا آرام یاد آیا۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا تمہیں گھر نہیں یاد آتا؟ تمھیں معلوم ہے ہمارے امتحان ہونے والے تھے؟ اس نے نہایت حوصلے سے جواب دیا۔ رفیق تم یہ سوچو کہ ہمارے بے گھر ہونے سے کتنے گھر آباد ہوں گے اور جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ہم نے نہ پڑھا تو کیا ہوا ہماری آئندہ نسلیں تو جاہل نہ ہوں گی۔ ہماری قوم کے بچے پڑھیں گے تو سمجھو کہ ہم نے پڑھ لیا۔ رفیق چچا یہ بتا رہے تھے اور مجھ پر جیسے گھڑوں پانی کسی نے ڈال دیا ہو، میں بہت بنا سوچ رہا تھا کہ میں اور میرے ساتھی یہ کیا کر رہے ہیں؟ ہمیں کیا کرنا تھا؟ ہماری منزل کیا تھی؟ اور یہ ہم کہاں پہنچ گئے؟ ادھر رفیق چچا اپنی دھن میں کہے چلے جا رہے تھے کہنے لگے الیکشن ہوئے اور ہماری اور ہمارے جیسے سینکڑوں طلبا کی محنتیں رنگ لائیں۔ مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا اور یوں ہمارا پیارا ملک... پاکستان وجود وجود میں آیا۔ اپنے ملک کو سجانے اور اپنی محنت کا پھل دیکھنے ہم بھی پاکستان چلے آئے مگر.... وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر ان کی آواز میں بے پناہ سوز سمٹ آیا

کہنے لگے جانتے ہو۔ سردی کی سیاہ رات میں میری دلجوئی کرنے والا وہ باہمت نوجوان کون تھا؟ وہ تمہارے والد تھے۔ میرے سر پہ جیسے کسی نے بہت بڑا گولہ لا کے مار دیا ہو۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کچھ دیر رفیق چچا کو دیکھتا رہا پھر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں اُٹھ کر ابا کے کمرے کی طرف دوڑا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور میری آواز رندھ گئی تھی۔ میں نے جاتے ہی ان کے پیروں کو پکڑ لیا اور مشکل اتنا کہہ سکا کہ "ابو جان!! مجھے معاف کر دیں" ابا جان نے مجھے اُٹھایا میرے سر پہ دیر تک ہاتھ پھیرتے رہے۔

قریشی صاحب نے رومال نکالا آنکھیں صاف کیں پھر کہنے لگے: "بس میرے عزیز! وہ دن میری زندگی میں انقلاب کا دن تھا۔ پھر میرے دوستوں میں بھی وہی رہ گئے جو نئی راہ پر میرے ساتھ چل نکلے۔ قائدِ اعظم نے میرے والد کو ایک پیغام دیا تھا۔ وہ پیغام میرے والد نے مجھ تک پہنچا دیا اور آج اس کو میں نے اس مادرِ وطن کے فرزندو!! تمہارے سینوں میں منتقل کر دیا ہے اب یہ تم پر ہے کہ تم اس پیغام کی دست کہاں تک برقرار رکھتے ہو۔ خدا تمہارا حامی و مددگار ہو۔"

چند مہینے بعد قریشی صاحب دفتر سے گھر پہنچے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"جی فرمایئے" انہوں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"ارے قریشی صاحب!! میں ظفر بول رہا ہوں"

"ظفر صاحب!! خیریت تو ہے"۔ قریشی صاحب ان کی تیز آواز سُن کر چونکے۔

"ہاں بھئی بالکل خیریت ہے بلکہ بہت خوشی کی خبر ہے۔ رزلٹ نکل آیا ہے۔ میرے رزلٹ کا کالج سب سے اچھا رہا ہے"۔

"میرا خیال ہے" قریشی صاحب نے مُسکراتے ہوئے کہا "تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہارے کالج کا رزلٹ سب سے اچھا رہا ہے"۔

"ہاں ہاں! یاد رہی، ہمارے صوبے نے پورے لڑکے میں الفوہ! ہمارے لڑکے نے پورے صوبے میں پوزیشن لی ہے" ظفر صاحب سے خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

"بھئی تمہیں بہت مبارک ہو اور تمہارے کالج کے ہونہار طلبا کو بھی" قریشی صاحب نے کہا۔

"تم مبارک باد کے مجھ سے زیادہ حق دار ہو" ظفر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا "سچی بات یہ ہے کہ تمہاری ہی تقریر سے ہمارے کالج کی کایا پلٹ گئی"

"ارے نہیں بھئی!! ایسا نہیں ہے، ظفر صاحب! یہ تمہاری نیک نیتی اور خلوص کا کمال ہے اور یہ دو چیزیں کبھی ضائع نہیں جاتیں اور ہاں تمہارے کالج کے لڑکے کے بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایک اچھی بات انہوں نے سُنی تو اس پر عمل کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ یار یہ لڑکے تو بہت اچھے نکلے۔ ویسے آج معلوم ہوا کہ پڑھ لکھ کر آدمی مبالغہ آمیزی میں کتنا ماہر ہو جاتا ہے" قریشی صاحب کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔ جواب میں ظفر صاحب کا قہقہہ بڑا زوردار تھا۔ ✡

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف: مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مُفت منگوانے کے لیے
صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجئے۔

اِس ماہ کے منتخب لطائف

کھٹ مٹھے

(انعامی لطیفہ)

ایک صحافی نے قائداعظم محمد علی جناح پر طنز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"مسٹر جناح! کیا یہ صحیح ہے کہ آپ پہلے کانگریس میں شامل تھے؟" قائداعظمؒ نے اُس کے لہجے کا طنز محسوس کرتے ہوئے بڑی برجستگی سے جواب دیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے مگر اُس سے پہلے تو میں پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔"

نائلہ رشید صدیقی۔ شکارپور

ایک دیہاتی جب تیسری دفعہ سینما کے ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ٹکٹ لینے آیا تو کلرک نے کہا۔

"بھئی تم پہلے بھی دو دفعہ ٹکٹ لے جا چکے ہو، ان کا کیا ہوا؟"

دیہاتی "کیا بتاؤں جی! وہاں دروازے پر ایک پاگل شخص کھڑا ہے جب میں اندر جانے لگتا ہوں تو وہ مجھ سے ٹکٹ لے کر پھاڑ دیتا ہے۔"

ایم مظہر ولایت۔ جھمیورانوالی

ایک دفعہ میرا چار سالہ بھائی ایک تقریب میں گیا۔ جہاں دو بہنوں کی منگنی کی رسم ایک ساتھ ادا کی جا رہی تھی۔ صبح کے وقت وہ دونوں لڑکیاں اُسے گھر سے باہر نظر آئیں تو وہ دوڑا دوڑا گھر آیا اور امی سے کہنے لگا "امی امی! آیئے دیکھیے دونوں منگنیاں باہر جا رہی ہیں۔"

ناصر شیراز۔ یاسر سرفراز آزاد کشمیر

بوڑھے شخص نے ایک شخص کو تین مچھلیاں پکڑے دیکھا ان مچھلیوں میں دو بڑی تھیں اور ایک چھوٹی۔

مینیجر: "اس ماہ تم کتنی چھٹیاں کر چکے ہو۔
ایک بار اپنی بیوی کو ٹرین پر سوار کرانے کی چھٹی لی۔
پھر ساس کے جنازے میں شرکت کے لیے رُخصت
لی۔ ایک دفعہ تمہاری بچی بیمار پڑ گئی اور ایک دفعہ
تمہارے بچے کی رسمِ بسم اللہ تھی۔ آج پھر درخواست
لے کر آگئے ہو۔ آج کیا ہوا ہے؟"
کلرک: "جناب آج میری شادی ہونے والی ہے۔"

کامران منیر۔ لیّہ

اس شخص نے بڑی مچھلیوں کو چھوڑ دیا اور چھوٹی
مچھلی کو باسکٹ میں رکھ لیا۔ بڑے میاں نے اس کا
سبب پوچھا۔ جواب ملا۔
"دراصل میرا فرائی پن بہت چھوٹا ہے۔"

عمران ارزانی ۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

ایک بچے کو باوجود کوشش کے ہفتے کے سات
دنوں کے نام یاد نہ ہوئے تو ماسٹر صاحب کو ایک ترکیب
سوجھی۔ انھوں نے بچے سے کہا "کیا تمہارے گھر
میں کوئی جانور وغیرہ ہیں؟" بچہ بولا: "جی مرغی کے سات
بچے ہیں۔" ماسٹر صاحب نے کہا "تو تم ہفتے کے سات
دنوں کے نام پر ان بچوں کے نام رکھ لو۔" کافی دن گزرنے
کے بعد ماسٹر صاحب نے ہفتے کے نام سنانے کو کہا۔
تو اُس نے سنایا: "پیر، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ، ہفتہ"
"اتوار" کہاں گیا؟ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔
"اتوار کو بلی کھا گئی۔" بچے معصومیت سے بولا۔

محمد مشتاق قریشی ۔ کراچی

باپ (بیٹے سے): "انسان بندر کی اولاد ہے۔"
بیٹا: "کیا میں بھی۔ ابو؟"

فیض شاہ ۔ کراچی

پی ٹی وی کے پروگرام راگ رنگ کا ایک منظر
ماسٹر صاحب: "تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ گرمی
سے چیزیں پھیلتی ہیں اور سردی میں سُکڑتی ہیں۔"
طالب علم: "جناب گرمیوں میں ہم پاؤں پھیلا
کر سوتے ہیں اور سردیوں میں سکیڑ کر۔"

محمد اعظم ۔ راولپنڈی

ایک صاحب کسی اجنبی کو بلدیہ کے دفتر کا پتہ
سمجھا رہے تھے۔ مگر ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
آخر انہوں نے آسان طریقہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔
"میاں یہاں سے بس میں بیٹھ جاؤ۔ جس جس
گھڑے پر دھکا لگے گنتے جاؤ۔ پچیسواں دھکا بہت

زور کا لگے گا۔ پوری بس اُچھل پڑے گی۔ بس وہیں اُتر جانا سامنے ہی بلدیہ کی عمارت ہے۔"

نصیر احمد قریشی۔ بھریا شہر

ایک مرتبہ روس کے صدر گورباچوف گاڑی پر کہیں جارہے تھے۔ اچانک انھوں نے گھبرا کر اپنے ڈرائیور سے کہا "ارے! صرف دس منٹ رہ گئے، جلدی کرو۔" ڈرائیور نے جواب دیا: "سر! میں تیز کار نہیں چلا سکتا کیونکہ اس طرح مجھے ٹریفک پولیس پکڑ لے گی۔" گورباچوف بولے "میں خود گاڑی چلاؤں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی اور ۸۰ میل کی رفتار سے گاڑی چلانے لگے، جلد ہی انھیں ٹریفک پولیس نے روک لیا، ٹریفک پولیس انسپکٹر چونکہ مصروف تھا اس لیے اُس نے ایک پولیس مین سے کہا "بھئی دیکھ کر آؤ اس گاڑی میں کوئی اہم شخصیت تو نہیں تاکہ ہم ڈرائیور کا چالان کر سکیں۔" پولیس مین تھوڑی دیر بعد آیا تو اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور جسم پسینے سے تر تھا، پولیس انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا "بھئی گاڑی میں کوئی اہم شخصیت تو نہیں؟" پولیس مین نے ہکلا کر جواب دیا "سر! یہ تو میں نہیں جانتا، لیکن اس گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جو شخصیت تشریف فرما ہے۔ اُس کے ڈرائیور صدر گورباچوف ہیں۔"

علی شان اظہر۔ لاہور

استاد (شاگرد سے) "بتاؤ سورج زیادہ دُور ہے یا فیصل آباد؟"

شاگرد: "جناب فیصل آباد۔"

اُستاد: "وہ کیسے؟"

شاگرد: "جناب سورج یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ مگر فیصل آباد تو نظر نہیں آتا؟"

سید وجاہت علی۔ گولارچی (سندھ)

اسکاٹ لینڈ کے لوگ دنیا میں کنجوسی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک اسکاٹ کو ہسپتال لایا گیا تو ڈاکٹر نے اُس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کے بعد اعلان کیا کہ یہ شخص مر چکا ہے۔" لوگوں نے پوچھا "آپ نے کس طرح جانا؟"

ڈاکٹر نے بتایا: "اگر کوئی اسکاٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور وہ خاموش لیٹا رہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مر چکا ہے۔"

گل شیر علی۔ پشاور صدر

ایک امیر آدمی نے ملا نصیر الدین سے کہا "عباسی خلفا میں یہ رسم تھی کہ وہ اپنے القاب میں عام طور پر

"باللہ" لگایا کرتے تھے۔ مثلاً معتصم باللہ، واثق باللہ مکتفی باللہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس زمانے میں، میں بھی خلیفہ ہوتا تو آپ مجھے کیا لقب دیتے؟"

ملی نے فوراً جواب دیا "نعوذ باللہ"

حامد اقبال صدیقی۔ اورنگی ٹاؤن کراچی۔

ڈاکٹر: "مریضہ سے" دیری گڈ میڈم! آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنا دو کلو گرام وزن کم کر لیا ہے۔"

خاتون نے شرماتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دراصل آج میں نے میک اپ نہیں کیا۔"

شکیل احمد، جمیل احمد۔ فیصل آباد

جج۔ (ملزم سے) "تمہارا کوئی گواہ ہے؟"

ملزم "حضور" میں کسی کے سامنے چوری نہیں کرتا۔"

زلیشان احمد۔ کھارادر

نرسری اسکول کی ایک بچی جب گھر جانے لگی تو مس سے بولی "مس مجھے جوتے پہنا دیں۔" مس بیچاری نے بڑی مشکل سے نیچے جھک کر اُسے جوتے پہنا دیے تو بچی بولی،

"مس یہ میرے جوتے نہیں ہیں" یہ سُن کر مس غصّے سے تلملا گئیں اور مرتے کیا نہ کرتے کے تحت اُس کے جوتے اُتار دیے۔

جب بچی جوتے اُتار کر پُرسکون بیٹھ گئی تو بولی "مس یہ جوتے دراصل میری بڑی بہن کے ہیں۔ لیکن امّی نے آج مجھے یہی پہنا کر بھیجا ہے آپ مجھے یہ پھر سے پہنا دیں۔"

شازیہ فرحین۔ ناظم آباد۔ کراچی

ایک شخص یہودیوں کے قبرستان میں گیا اور منتظم سے بولا "میرا کتا مر گیا ہے کیا اُسے میں یہاں دفن کر سکتا ہوں؟" منتظم نے غصّے سے کہا "کتا اور یہودیوں کے قبرستان میں! بالکل نہیں۔" اُس شخص نے کہا "اگر میں عیسائیوں کے قبرستان میں جاؤں اور انہیں دس ہزار ڈالر دوں تو کیا وہ مجھے کتے کو دفن کرنے کی اجازت دے دیں گے؟" منتظم نے مسکراتے ہوئے کہا "دس ہزار ڈالر! آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ یہ ایک یہودی کتا تھا۔"

حسن مہدی خراسانی۔ کراچی

ایک چور بچّے کا قصّہ جسے سُن کر دوسرے بچّے نے چوری ترک کر دی

"ہر چند کہ بُرائی، جھوٹ اور غیبت بڑی دل فریب اور دلکش باتیں ہیں، مگر ان سے پیچھا چھڑانا غیر ممکن بات نہیں۔" کلاس ٹیچر سر ریحان نے نرمی سے شہباز کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ شہباز نے ایک لڑکے ریحان کا فاؤنٹین پین چوری کر لیا تھا جو اس کے پاس سے برآمد کیا جا چکا تھا۔ سر ریحان کی بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ بڑی سے بڑی غلطی یا جرم پر بھی کسی طالب علم کو اذیت ناک سزا تو دُور کی بات، معمولی مار پیٹ تک، کرنے کے قائل نہ تھے۔ شہباز کئی بار کلاس کے

وہ لڑکا

سیّد کاشان جعفری

لڑکوں کی کوئی نہ کوئی چیز چُرانے کے الزام میں پکڑا جا چکا تھا۔ وہ صرف چوری کرنے کا عادی ہی نہیں تھا بلکہ اِدھر کی اُدھر لگا کر اچھے دوستوں کے دلوں میں بھی نفاق پیدا کر دیتا۔ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے اُن کی بُرائیاں کرنا بھی اُس کی عادت تھی۔ اُسے ان حرکتوں پر اچھی خاصی سزائیں بھی مل چکی تھیں۔ مگر یہ سزائیں اُسے راہِ راست پر نہ لا سکیں۔ سر ریحان نے ابھی گزشتہ ہی ہفتے ہماری کلاس کا چارج لیا تھا۔ وہ اُردو محل اسکول سے خصوصی طور پر ہمارے یہاں ٹرانسفر ہو کر آئے تھے۔ اور

اُن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنے طلبہ سے بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے ہیں اور نفسیاتی طریقے سے ان کے مسائل کو حل کرتے ہیں۔

انہوں نے ایک لمحہ توقف کر کے پھر کہنا شروع کیا، دیکھو بچو۔ بُرائی میں اتنی طاقت کبھی نہیں ہوتی کہ وہ زبردستی کسی کے ساتھ چمٹی رہے. اگر آپ اسے مُنہ لگانے کے بجائے دھتکار دیں اور دھتکارتے رہیں تو آپ کا ساتھ چھوڑ دے گی. میں آپ کو کسی بڑی شخصیت کی نہیں بلکہ آپ کی عمر کے ایک بچّے کی سچی کہانی سناتا ہوں. یہ کہانی شاید آپ کو سوچنے پر مجبور کر دے. کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک لڑکا جس کی عمر بمشکل بارہ سال کی ہوگی ایک پرہجوم اور بارونق بازار سے ایک راہ چلتی خاتون کا پرس چھین کر بھاگ نکلا... خاتون چیخنے چلاّنے لگی. پکڑو..... پکڑو.... ہائے میں لُٹ گئی. میں برباد ہوگئی.... وہاں پہ موجود لوگوں نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا لڑکا بڑی تیزی اور پھُرتی سے بچتا بچاتا لوگوں سے کتراتا بھاگ رہا ہے. کئی لوگ اس کے پیچھے اُسے پکڑنے کو لپکے...... مگر کچھ دُور تک دوڑ کر رہ گئے۔ وہ لڑکا سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوا دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگیا. مگر ایک نوجوان نے ہمّت نہ ہاری وہ برابر اُسی لڑکے کا پیچھا کرتا رہا۔ لڑکا پُررونق بازار سے نکل کر بازار کی پشت پر رہائشی حصّے میں داخل ہوگیا. اُس نے فرار ہونے کے لئے نسبتاً سنسان گلیوں کا انتخاب کیا. ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ ان گلیوں کے چپّے چپّے سے بخوبی واقف ہے. نوجوان نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا وہ نوجوان ایک طالب علم تھا اور طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین کھلاڑی بھی..... کالج کے سالانہ کھیلوں کے مقابلوں میں کئی سو میٹر کی ریس میں کئی بار اوّل آنے پر اعزاز بھی حاصل کر چکا تھا مگر آج وہ ایک چھوٹے سے لڑکے کے مقابلے میں پیچھے رہ گیا تھا. اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ رہائشی علاقے کی ان گلیوں سے پوری طرح واقف نہیں تھا. ممکن تھا۔ وہ گلیوں کی بھُول بھُلیّوں میں پھنس کر اُس لڑکے کا تعاقب ختم کر دیتا وہ ایک گلی میں پہنچ کر سوچنے لگا کہ کسی طرف جائے.... کیونکہ جس جگہ وہ کھڑا تھا وہ تین گلیوں کا سنگم تھا... ابھی وہ کسی فیصلے پر پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ اچانک پرس لے کر بھاگنے والا لڑکا خود ہی اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور بولا، معاف کیجئے گا جناب، میں نے آپ کو بہت تنگ کیا بہت دوڑایا... مگر اب میں آپ کے سامنے ہوں. اُس خاتون سے چھینا ہوا یہ پرس بھی موجود ہے، چلیئے اب مجھے اب اس پرس سمیت پولیس کے حوالے کر دیجئے.... دیکھئے جناب سوچنے کا قطعی وقت نہیں ہے. آپ کی ذرا سی تاخیر میرے بنے بنائے کام کو بگاڑ سکتی ہے.... پلیز جلدی کریں. یہیں قریب ہی دو گلیوں کے بعد مین روڈ پر پولیس چوکی ہے. مجھے آپ وہاں لے چلیں۔ وہ نوجوان اس اُچکّے لڑکے کی اس عجیب و غریب فرمائش اور اصرار پر حیران رہ گیا۔ لڑکے کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں ڈر، خوف نام کی کوئی جگہ نہیں تھی بلکہ

ان میں ایک آہنی عزم جھلک رہا تھا، نوجوان واقعی شدید اُلجھن کا شکار ہو چکا تھا۔ کہاں تو وہ اس لڑکے کو پکڑنے دوڑا تھا۔ اور اس کے دوڑنے کا مقصد یہی تھا کہ لڑکے کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دے مگر عین اس وقت جب وہ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد واپس لوٹنے کا فیصلہ کر رہا تھا تو وہی لڑکا خود اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اب اصرار کر رہا تھا کہ بازار میں خانوں سے چھینے ہوئے پرس کے ساتھ اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے ... اُسے سوچ کے دریا میں غوطہ زن دیکھ کر لڑکا پھر گڑگڑایا، جناب کس سوچ میں پڑ گئے ..... یہ تاخیر مجھے ہی نہیں خود آپ کو بھی کسی بڑی مُصیبت میں پھنسا سکتی ہے۔ جلدی کریں۔

اس بار اُس نوجوان نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ اور لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر گلیوں سے ہوتا ہوا ایک بس اسٹاپ پر جا نکلا، پھر وہاں سے ایک بس کے ذریعہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر دونوں نے سکون کا سانس لیا... مگر وہ نوجوان اب بھی اسی سوچ میں گم تھا کہ اب کیا کریں۔ ایک طرف تو اس کا کھلا جرم تھا۔ جس کا وہ خود اقرار کر رہا تھا۔ دوسری طرف خود آ کر سامنے کھڑا ہو جانا اور بار بار پولیس کے حوالے کر دینے کی خواہش کا اظہار کرنا اُسے اُلجھن میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ گھر پہنچنے کے بعد اسی مجرم لڑکے نے بڑی نرمی سے کہا، جناب آپ مجھے اپنے گھر کیوں لے آئے... میں نے تو کہا تھا کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔ وہ نوجوان بولا بھائی میں یہاں اس لئے لے آیا ہوں کہ یہ میرا اپنا گھر ہے۔ یہاں اطمینان سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ اب تم پہلے ہاتھ مُنہ دھو لو، پھر ہم دونوں چائے پیتے ہوئے باتیں کریں گے۔ تم مجھے بتاؤ گے کہ آخر تم نے پرس چھیننے کی حرکت کیوں کی .. یہ پہلی بار ایسا کیا ہے۔ یا پہلے بھی کرتے رہے ہو .... اور یہ کہ تم آخر تھانے جانے کے لئے اصرار کیوں کر رہے ہو.... کیا تمہیں پولیس سے کوئی خوف نہیں محسوس ہوتا.. ؟

مُنہ ہاتھ دھو کر وہ دونوں تازہ دم ہو گئے۔ آمنے سامنے کی دو کرسیوں پر بیٹھے تو ملازم نے ایک بڑے میں چائے لا کر رکھ دیں۔ نوجوان نے لڑکے سے کہا، لو میاں کھاتے بھی جاؤ اور اپنا احوال بھی سناتے جاؤ۔ میرا پہلا سوال تو یہ ہے کہ جب تم مجھ سے بچ کر نکل گئے تھے تو پھر خود بخود اپنے آپ کو گرفتار کرانے کے لئے میرے سامنے کیوں آ گئے۔ لڑکے نے بڑے سکون اور اعتماد سے کہا، تاکہ آپ مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر یہ بات ہے تو تم خود بھی پولیس چوکی پہنچ کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر سکتے ہو۔ نوجوان نے کیک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا مُنہ میں ڈالتے ہوئے پھر سوال کیا۔

لڑکا، ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا، دراصل ایسا کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔ دوسرے آپ کو دُور تک بھگانے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے خود یہ اطمینان ہو جائے کہ آپ اُن لوگوں میں سے تو نہیں ہیں .... ؟... اور جب یہ اطمینان ہو گیا تو خود کو آپ کے حوالے کر دیا۔ نوجوان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ ہاتھ میں

پکڑا ہوا کیک مُنہ میں ڈالنا بھول گیا، اور تجسس آمیز لہجے میں بولا۔ بھائی وہ کون ہیں؟ ان لوگوں سے کیا مراد ہے تمہاری، میاں صاف اور واضح گفتگو کرو پہیلیاں بجھوا کر وقت مت ضائع کرو۔

لڑکا اسی اطمینان سے بولا۔ جناب آج سے تقریباً ۶ سال قبل کی بات ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں اغوا کرلیا۔ نوجوان پھر اُلجھ کر بولا۔ میاں ان لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے.... کون ہیں یہ لوگ...؟ اور ہمیں کیا مطلب؟ کیا تم اکیلے نہیں تھے۔ اغوا کے وقت.... کیا کوئی اور بھی تمہارے ساتھ اغوا ہوا ہے....؟

ہے نہیں... جناب ہوا تھا کہتے ہوئے اس لڑکے کی آنکھیں بھر آئیں وہ میرا بہت ہی اچھا ساتھی تھا۔ انور... ہم دونوں ایک ہی محلے میں قریب قریب رہتے تھے، اور ایک ہی اسکول سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے ابّو سعودی عرب میں انجنیئر تھے اور چچا کسی بینک میں منیجر اُس دن بھی ہم دونوں معمول کے مطابق گھر سے اسکول جانے کے لئے نکلے۔ آپس میں دونوں باتیں کرتے، ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کنارے کنارے اسکول کی طرف چلے جارہے تھے۔ تب ہی ہمیں گلی کے ایک موڑ پر اغوا کرلیا گیا۔ اغوا کرنے والے صرف انور کو ہی اغوا کرنا چاہتے تھے تاکہ اس کے عوض بھاری رقم حاصل کی جاسکے۔ مگر ساتھ ہونے کی وجہ سے مجھے بھی ان لوگوں نے اغوا کرلیا... یہ کہہ کر وہ رُکا۔ اور نوجوان نے حیرت سے پوچھا، پانچ سال قبل..... جی ہاں تقریباً اتنا ہی عرصہ ہوا ہوگا وہ لڑکا جواب میں بولا۔ ان لوگوں نے انور کے والدین سے بہت بڑی رقم طلب کی۔ جس کے جواب میں انہوں نے خاموشی سے پولیس کو خبر کردی۔ پولیس نے انور کی رہائی کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا۔ نہ جانے کس طرح ان لوگوں کو اس کا پتہ لگ گیا اور انہوں نے انتقاماً انور کو میرے ہی سامنے گولیوں سے چھلنی کردیا۔ یہ کہہ کر وہ بے ساختہ رونے لگا۔ نوجوان نے اسے تسلی دی۔ پانی پلوایا۔ پھر چائے پینے کے لئے کہا۔ کافی دیر بعد وہ اپنے جذبات پر قابو پا سکا۔

اور بولا... میں نے اُسی دن یہ عہد کرلیا تھا کہ اپنے معصوم ننھے دوست کے بلاقصور مارے جانے کا بدلہ ان بدمعاشوں سے ضرور لوں گا۔ انہوں نے مجھے سیدھا سادا سمجھ کر نظر انداز کردیا تھا یوں بھی انہیں علم تھا کہ میرے والدین میری رہائی کے لئے چند ہزار بھی خرچ نہ کرسکیں گے اور یوں ہی چھوڑ دینا انہیں پسند نہ تھا۔ ایک شخص تو مجھے ہلاک کردینے کے درپے تھا۔ مگر ابھی میری زندگی باقی تھی اس لئے سردار نے یہ کہہ کر اُسے روک دیا کہ اس لڑکے کو ہم اپنے کام کا بنائیں گے۔ گزشتہ دو سالوں سے انہوں نے مجھے کام پر لگا دیا تھا۔ اور وہ کام یہی تھا۔ یعنی بازار میں تنہا آنے والی فیشن ایبل خواتین کے ہاتھوں سے پرس چھین کر بھاگ جانا یا کسی موٹی آسامی کو دیکھ کر اس کی جیب کاٹ لینا.... اس کام میں کئی

افراد میری نگرانی کرتے، وہ یہاں تک نظر رکھتے کہ میں کسی سے کوئی بات بھی نہ کر پاؤں۔ اگر میں اتفاقاً کبھی پکڑ لیا جاتا تو گروہ کا کوئی آدمی ایک آدھ تھپڑ مار کر بیچ بچاؤ کراتے ہوئے مجھے چھڑا کر بھگا دیتا۔ اسی لئے کبھی پولیس تک پہنچنے کی نوبت نہ آتی۔ یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہوا اور کپ اُٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ شاید چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی..... نوجوان اُسے بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا... لڑکے نے پھر کہنا شروع کیا۔ اتفاق ہے کہ آج اُن میں سے کوئی آپ کے پیچھے نہیں آیا۔ میں نے گلی میں چھپ کر یہی اطمینان کیا تھا۔ جب آپ ہی میرا پیچھا کرتے ہوئے اکیلے وہاں تک پہنچے ہیں۔ تو پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج اپنی اسکیم پر عمل کروں..... یہ ہے میری مختصر سی داستان... اب میں آپ کے اختیار میں ہوں۔ مگر ایک بات کا اور خیال رکھیں کہ مجھے علاقے کے تھانے میں نہ لے جائیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا تھانوں میں بہت اثر ہے وہ مجھے چھڑا لیں گے۔ اور حقیقت کا علم ہونے پر وہی حشر میرا بھی ہوگا جو انہوں نے انور کا کیا تھا۔

لڑکا اپنی بات پوری کر کے خاموش ہو گیا۔ نوجوان عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ لڑکے کا یہ خیال بھی ٹھیک تھا کہ اگر علاقے کی چوکی میں پولیس کے حوالے کیا تو کہیں وہی کچھ نہ ہو جس کا اظہار لڑکے نے کیا تھا۔ یقیناً جب وہ لوگ عادی مجرم ہیں اور اس قسم کی وارداتیں کرتے ہیں تو یقیناً ان کے وسائل اور پہنچ بھی زیادہ ہوگی۔ کافی غور خوص کے بعد نوجوان نے اُس لڑکے سے کہا، ٹھیک ہے ابھی تو یہاں آرام کرو۔ میں پہلے باہر نکل کر جائزہ لیتا ہوں کہ کوئی مشکوک آدمی ارد گرد موجود تو نہیں، پھر اپنے علاقے کی ایک اہم شخصیت سے مشورہ کر کے تمہیں آگاہ کروں گا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا۔

نوجوان نے مختلف بہانوں سے کئی بار اپنی گلی میں اِدھر اُدھر چکر لگائے اور یہ اطمینان ہو جانے پر کہ اس گلی میں کوئی اجنبی یا مشکوک شخص نہیں ہے۔ محلے کی ایک معزز اور بااثر شخصیت کے گھر چلا گیا۔ معزز شخص بھی ساری تفصیل سن کر حیران رہ گیا۔ عجیب کیس ہے یہ، مگر اس سے بھی عجیب وہ نوعمر لڑکا ہے جو اس گروہ کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لئے جان پر کھیل گیا ہے۔ دونوں میں صلاح و مشورے ہوئے پھر نوجوان اپنے گھر واپس آ گیا.....

دوسرے دن معزز مددگار نے نہایت خاموشی کے ساتھ پولیس کے اعلیٰ افسر سے ملاقات کر کے تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ پولیس افسر بھی لڑکے کی ذہانت اور ہمت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور شام کو خود اُس سے ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

شام ہوئی پولیس افسر سادہ کپڑوں میں عام شہری کی طرح پہلے علاقے کے معزز کے گھر پہنچا۔ پھر

وہ دونوں اُس نوجوان کے گھر آئے۔ لڑکے نے اس گفتگو میں گروہ کے ارکین کے حلیئے اور ان کی خفیہ پناہ گاہوں کے متعلق بھی بتایا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ چھ لڑکے اور ان کے پاس موجود ہیں جو مختلف شہروں اور کراچی کے محلّوں سے اغوا کر کے لائے گئے ہیں۔ یہ طے ہوا کہ ابھی چھاپہ نہ مارا جائے۔ کیونکہ تمہارے اس طرح غائب ہو جانے سے وہ خود بھی ہوشیار ہو چکے ہوں گے۔ دو تین دن کے بعد جب وہ محسوس کریں گے کہ تمہارے غائب ہو جانے سے کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوا تو پھر وہ اپنی سرگرمیاں شروع کریں گے تب اِن پر چھاپہ مارنا مفید ہو گا۔ کونسلر اور اُس نوجوان نے بھی پولیس افسر کی رائے سے اتفاق کیا اور یوں یہ ملاقات ختم ہو گئی۔

پولیس افسر نہایت خاموشی سے شہر کی پولیس چوکیوں کے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ مگر کہیں اُسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی اس کا مطلب یہ تھا کہ گروہ بہت شاطر ہے۔ پھر پانچویں دن اُس نے کونسلر کے ذریعہ اُس لڑکے سے پھر ملاقات کی، اور پوچھا، بیٹے تمہارا گھر کہاں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کس علاقہ سے اغوا کیا گیا تھا۔ مگر لڑکا یہ نہ بتا سکا بہت یاد کرنے پر اسے صرف اسکول کا نام یاد آگیا۔ مہران بوائز انگلش اسکول پولیس افسر نے نہایت خفیہ طریقے سے اسکول کا پتہ چلا کر وہاں کے تھانے سے پانچ سال قبل دو لڑکوں کے اغوا کی تفصیل چاہی اور یوں وہ حیدر آباد، لطیف آباد تک پہنچ گیا یہ کارروائی پولیس افسر نے اس لئے کی کہ ممکن ہے مجرم اس لڑکے کے گھر کی نگرانی کر رہے ہوں.... اور اس کا یہ شبہ درست نکلا تیسرے ہی دن اُس نے وہاں دو مشکوک افراد کو گرفتار کر لیا۔ اور کراچی لا کر ان کی نشاندہی پر پورے گروہ کو گرفتار کر لیا۔ جو واقعی لڑکے کے بھاگ جانے کے بعد ہر رات نئی جگہ بسیرا کرتا تھا۔ اور اس کا علم گروہ کے صرف پرانے ارکان کو ہوا کرتا تھا۔ گروہ کی گرفتاری کے بعد ان کی نشاندہی پر باقی اغوا شدہ لڑکے بھی برآمد کر لئے گئے یوں ایک لڑکے کے دل میں موجود رہنے والی نیکی اور نیک بنے رہنے کے جذبے نے نہ صرف اسے برائی سے نکال لیا بلکہ کچھ اور معصوم بچے گروہ کے ہاتھوں برائی میں پڑنے سے محفوظ ہو گئے کہتے ہوئے سر ریحان نے اپنی بات ختم کر دی....

تب ہی ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر سوال کیا..... سر..... وہ لڑکا کون تھا۔ اب کہاں ہے... آپ نے اُس کا نام تو بتایا ہی نہیں..... سر ریحان اُس لڑکے کا سوال سُن کر مسکرائے۔ پھر اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے بولے... بیٹے لڑکے کا نام ریحان تھا اور اب وہ خود تمہارے سامنے کھڑا ہے....

ان کے اس جواب پر سب لڑکے انہیں حیرت سے دیکھنے لگے.... کئی آوازیں ایک ساتھ کلاس میں بلند ہوئیں... سر آپ.....؟ آپ تھے... وہ لڑکا.....

ہاں بچو..... میں ہی وہ لڑکا ہوں۔ گروہ کی گرفتاری کے بعد جب میں پولیس آفیسر، کونسلر اور اس فرشتہ

صفت نوجوان جس کا نام حنیف تھا۔ لطیف آباد میں اپنے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرے غریب والدین میرے اغوا کا صدمہ برداشت کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے ..... تب میں ان تینوں کے ساتھ واپس کراچی آگیا۔ حنیف صاحب نے ہی مجھے اپنے گھر کا ایک فرد بنا کر ساتھ رکھ لیا۔ میری تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی۔ اور یوں میں ایک اُستاد کی صورت میں آپ سب کے سامنے ہوں ..... اس واقعے کے بعد سے شہباز بھی ایک اچھا مثالی لڑکا بن گیا۔ اور لوگ اسکی اچھائیوں، اس کے کردار کی تعریفیں کرنے لگے ....

بے خبر

مالک نوکر سے "کہو بھئی، گھر کا کیا حال ہے ؟ سب لوگ خیریت سے تو ہیں نا ؟"

نوکر :۔ "جی ہاں، سب لوگ خیریت سے ہیں۔ لیکن .... !"

مالک :۔ "لیکن کیا ؟"

نوکر :۔ "جی، وہ آپ کا ٹونی مر گیا ہے۔"

مالک :۔ "اوہ، میرا کتا مر گیا .... کب ؟"

نوکر :۔ "جب اس نے آپ کے مرحوم گھوڑے کی ہڈیاں کھائی تھیں"

مالک "تو کیا میرا گھوڑا بھی مر گیا ؟"

نوکر :۔ "جی ہاں، گھاس کھائے بغیر بیچارہ کیسے جی سکتا تھا۔"

مالک :۔ "اور وہ پیسے کہاں گئے، جو میں نے تمہیں گھاس کے لئے دیئے تھے ؟"

نوکر :۔ "وہ تو آپ کی والدہ کے کفن دفن پر خرچ ہو گئے۔"

مالک :۔ "ہائے ہائے، تو کیا میری پیاری والدہ بھی خدا کو پیاری ہو گئیں ؟"

نوکر :۔ "جناب پوتی کا غم تھوڑا تو نہ تھا۔ بیچاری بوڑھی تو تھیں، غم نہ سہہ سکیں اور ..... !"

مالک :۔ "تو کیا یہ سچ ہے کہ میری اکلوتی بیٹی بھی مجھ سے جُدا ہو گئی ؟"

نوکر :۔ "جی ہاں، بھلا تین ماہ کی جان ماں کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی تھی ؟"

مالک :۔ "مگر اس کی ماں کدھر گئی تھی .... ؟"

ندیم آفاق _____ ملیر کالونی، کراچی۔

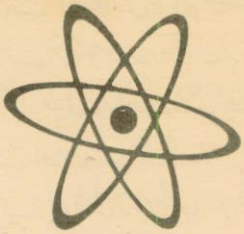

سائنس انکوائری

سائنسی موضوعات پر آپ کے سوالات، ہمارے جوابات

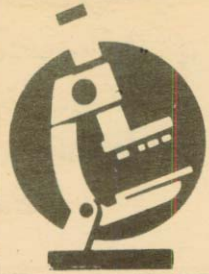

نیر ابدالی

● کیا یہ حقیقت ہے کہ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے؟ (عرفان احمد۔ پی آئی ڈی سی ہاؤس۔ کراچی)

جی ہاں! ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو پہلی مرتبہ کسی انسان نے چاند کی سطح پر اپنا قدم رکھا۔ یہ شخص امریکی خلانورد نیل آرمسٹرانگ تھا۔ وہ اپنے جہاز اپالو ۱۱ میں ۱۶ جولائی ۱۹۶۹ء کو کیپ کینیڈی سے روانہ ہوئے تھے۔ اس خلائی جہاز میں جو دو اور خلانورد سوار تھے۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ مائیکل کولنز اور ایڈون ایلڈرن۔ آخر آپ چاند تک انسان کے پہنچنے کے معاملے میں اس قدر مشکوک کیوں ہیں؟

● اسلامی ممالک سائنس کے شعبے میں غیر مسلم ممالک سے پیچھے کیوں ہیں؟ (احسن اختر زبیری مصطفےٰ زبیری۔ نارتھ کراچی)

اس کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ تقریباً تمام مسلم ممالک ترقی پذیری کے دور سے گزر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ دیگر مغربی ممالک سے مختلف شعبوں میں امداد لینے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ غیر مسلم ممالک کی کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی طرح بھی ان مسلم ممالک کو اپنے حلقۂ اثر میں رکھا جائے اور ان کو ترقی نہ کرنے دیا جائے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مسلم ممالک میں بڑے قابل جواہر موجود ہیں۔ جو ملک و ملت کی ترقی و استحکام کے لیے اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ سب سے بڑی مثال پاکستان کی ہے۔ ہمارے ہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں کئی بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیتیں موجود ہیں۔ جن کی شب و روز محنت نے پاکستان کو مسلم ممالک میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی مسلم ممالک کی پسماندگی کی کچھ وجوہات ہیں۔ مگر وہ چونکہ سیاسی نوعیت کی ہیں اس لیے ہم اُن کا ذکر مناسب نہیں سمجھتے۔

● اگر پانی اُبل رہا ہو تو اس سے نکلتی ہوئی بھاپ بڑی گرم کیوں محسوس ہوتی ہے؟ (ابنِ مفرح دل۔ مردان سید علی رضا۔ پشاور۔

ظاہر سی بات ہے کہ گرم پانی سے نکلتی ہوئی

بھاپ گرم ہی محسوس ہوگی۔ اس سے ٹھنڈک کی توقع کرنا سراسر غلط ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس بھاپ میں گرمی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں بڑی قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی قوت [illegible] ہیں۔ بلکہ آج بھی بہت سی ریل گاڑیوں کے انجن بھی بھاپ کی مدد سے چل رہے ہیں۔

● **بجلی کا بلب کیسے روشن ہوتا ہے** ؟(عاصم نعمانی قاسم نعمانی۔ سمن آباد، لاہور۔ نسیم زکریا، لیاقت آباد۔ کراچی۔)

جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے بجلی کا بلب ایڈیسن نے ۱۸۷۸ء میں ایجاد کیا۔ بلب میں ٹنگسٹن کے تار استعمال ہوتے ہیں۔ یہ تار ۳۲۰۰ درجہ سینٹی گریڈ تک حرارت برداشت کر سکتے ہیں۔ کچھ بلب میں بخارات بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو سوڈیم یا پارے کے بخارات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بخارات سے روشنی گزرنے پر وہ گرم ہو جاتے ہیں اور روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بلب نسبتاً کم بجلی خرچ کرتے ہیں مگر مقابلے میں روشنی زیادہ فراہم کرتے ہیں۔

● **خلا سے زمین چمکتی ہوئی کیوں دکھائی دیتی ہے** ؟(عمران احمد۔ سلمان احمد۔ فیصل آباد۔ شیریں مختار۔ ساھیوال۔)

اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین سورج کی روشنی کو منعکس کرتی ہے۔ آپ نے اپنی سائنس کی کتاب میں پڑھا ہوگا کہ ستاروں کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ [illegible] سیاروں کی اپنی روشنی نہیں ہوتی بلکہ وہ سورج کی روشنی منعکس کرتے ہیں۔ امید ہے کہ زمین کی چمک کی وجہ آپ حضرات کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔

● **کیا واقعی دنیا میں سفید ہاتھی پائے جاتے ہیں** ؟(محمد اعجاز خان بابر۔ جامشورو۔ قادر علی، سکھر۔)

بھئی "سفید ہاتھی" ایک اصطلاح ہے۔ اس کا حقیقی دُنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ اصطلاح عموماً کسی محکمے کے بارے میں استعمال کی جاتی ہے۔ جب وہ محکمہ عوامی خدمت کے بجائے قومی خزانے پر بوجھ بن جائے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ حکومت کسی منصوبے یا ادارے کے قیام کا بڑے زور و شور سے اعلان کرے۔ وہ منصوبہ یا ادارہ قائم بھی ہو جائے۔ مگر کچھ عرصے کے بعد جب یہ پتا چلے کہ یہ سب کچھ

ڈھکوسلہ تھا۔ تو یہ اصطلاح اخبارات کے ذریعے لوگوں میں عام ہو جاتی ہے۔ کہ یہ ادارہ تو "سفید ہاتھی" ہے۔ جو قومی خزانے پر بوجھ بنا ہُوا ہے۔ اُمید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

عقیل عباس جعفری

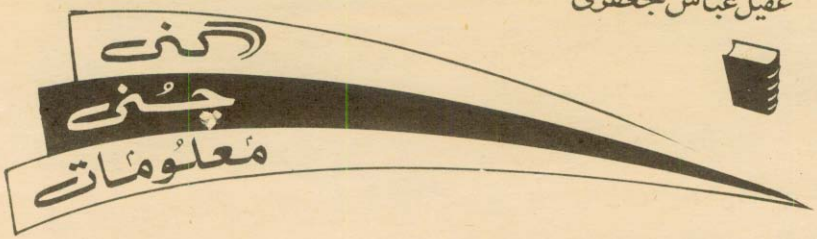

اعداد ہماری زندگی کا جزوِ لازم ہیں۔۔۔ ظاہری واقعات ہوں یا باطنی معاملات، یہ سب کسی نہ کسی طرح اعداد اور ہندسوں سے جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اعداد سے ہماری زندگی کے اس گہرے تعلق کی اہمیت کے پیشِ نظر ہمارے محقق ساتھی عقیل عباس جعفری نے بڑی محنت اور جانفشانی سے معلومات کا یہ انوکھا سلسلہ شروع کیا ہے جو اعداد کے گرد گھومتا ہے۔ صفر سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ دیکھیں کہاں جاکر ختم ہوتا ہے۔۔۔ اس مفید سلسلے کو پڑھیے اور اعداد کے حوالے سے اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے (ادارہ)

(۵۶)

- ٹیسٹ کرکٹ کی تیز ترین سینچری ۱۵، اپریل ۱۹۸۶ء کو غرب الہند کے کھلاڑی ویوین رچرڈز نے انگلستان کے خلاف صرف ۵۶ گیندیں کھیل کر بنائی تھیں۔
- پاکستان ۳۰، ستمبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کا رکن بنا۔ وہ اقوامِ متحدہ کا ۵۶ واں رکن مُلک تھا۔
- بُوعلی سینا کا انتقال ۱۰۳۷ء میں ہوا۔ اس وقت اُن کی عمر ۵۶ برس تھی۔
- اقوامِ متحدہ کے دوسرے سیکریٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ کی عمر ۵۶ برس تھی۔ جب ان کا ایک ہوائی حادثے میں انتقال ہوا انھیں بعد از مرگ نوبل انعام سے نوازا گیا۔
- ۱۹۵۹ء میں فلم بن حر کے بعض مناظر کی عکاسی کے لیے ۵۶ کیمرے استعمال ہوئے تھے۔
- ایڈولف ہٹلر نے ۵۶ برس کی عمر میں خودکشی کی تھی۔
- سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن کی تصویر ۵۶ مرتبہ دنیا کے مشہور جریدے ٹائم کے سرِورق پر شائع ہوئی جو ایک ریکارڈ ہے۔
- چین میں ۵۶ نسلی گروپ ہیں۔
- سر آرتھر کانن ڈائل نے شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن کے کرداروں پر مشتمل ۵۶ کہانیاں تخلیق کی تھیں۔
- قتل کے وقت امریکی صدر ابراہام لنکن کی عمر ۵۶ سال تھی۔

(۵۷)

- دنیا کی اوسط آبادی ۵۷ نفوس فی مربع میل ہے۔
- ایک گھنٹے کی ڈرائیونگ میں کار کے پہیے تقریباً ۵۷ ہزار چکر مکمل کرتے ہیں۔
- دنیا کے عظیم کرکٹر گیری سوبرز نے ٹیسٹ کرکٹ میں فی اننگ ۵۷٫۸ رنز کی اوسط سے مجموعی طور پر ۸۴۳۲ رنز بنائے تھے۔
- شہادت کے وقت امام حسینؓ کی عمر مبارک ۵۷ برس تھی۔
- دنیا کی ۵۷ فیصد آبادی ایشیا میں رہتی ہے۔
- شبلی نعمانی کی وفات ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۷ برس تھی۔
- ایران میں مردوں اور عورتوں دونوں کی اوسط عمر ۵۷ سال ہے۔
- ٹیلیوژن کے موجد جان لوگی بیرڈ کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ۵۷ برس کی عمر میں ہوا۔
- مشتاق محمد نے اپنے ٹیسٹ کیریئر میں ۵۷ ٹیسٹ میچوں میں حصہ لیا تھا۔

(۵۸)

- پہلی گول میز کانفرس میں ہندوستانی مندوبین کی تعداد ۵۸ تھی۔
- مُرغی کے انڈے کا ۵۸ فیصد حصہ زردی پر مشتمل ہوتا ہے۔
- جان ملٹن کی مشہور نظم جنتِ گم گشتہ ۱۶۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۸ برس تھی۔
- لان ٹینس کی گیند کا انتہائی وزن ۵۸٫۵۰ گرام ہوتا ہے۔
- خلا میں بھیجا جانے والا معمر ترین شخص امریکہ کا کارل جی ہینز تھا۔ جو ۲۹ جولائی ۱۹۸۵ء کو چیلنجر کے ذریعے اپنے مشن پر روانہ ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۵۸ برس تھی۔
- ایتھوپیا کے بادشاہ ہیل سلاسی ۵۸ برس برسر اقتدار رہے تھے۔
- ۱۳ ستمبر ۱۹۲۲ء کو لیبیا کے مقام العزیزیہ پر دنیا کی سخت ترین گرمی پڑی۔ اس دن وہاں کا درجہ حرارت ۵۸ درجے سینٹی گریڈ (۱۳۶٫۴ درجے فارن ہائیٹ) تھا۔
- ۱۸۹۶ء میں لندن سے برمنگھم تک دنیا کی پہلی موٹر ریس میں ۵۸ کاروں نے حصہ لیا تھا۔
- چارلس ڈکنز، برتولت بریخت اور گستاو فلوبیئر، ان تینوں ادیبوں کا انتقال ۵۸، ۵۸ برس کی عمر میں ہوا تھا۔
- دنیا کے پہلے خلائی جہاز اسپٹنک اول کا قطر ۵۸ سینٹی میٹر (۲۲٫۲ انچ) تھا۔

(۵۹)

- ابراہیم اسمٰعیل چندریگر پاکستان کے چھٹے وزیراعظم تھے۔ وہ فقط ۵۹ دن اپنے عہدے پر فائز رہے۔
- دنیا میں سب سے کم فی کس سالانہ آمدنی چاڈ کے باشندوں کی ہے یعنی ۵۹ امریکی ڈالر سالانہ۔
- سوئے ہوئے انسان کی نبض کی رفتار ۵۹ فی منٹ ہوتی ہے۔
- ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ نے امہات المؤمنین میں سب سے آخر میں وفات پائی۔ آپ کا انتقال ۵۹ھ میں ہوا تھا۔
- زمین سے چاند کا صرف ۵۹ ٪ حصہ دیکھا جا سکتا ہے۔
- ایجاد کے پہلے دن رائٹ برادران نے اپنے ہوائی جہاز کو تین مرتبہ اُڑایا اور مجموعی طور پر ۵۹ منٹ پرواز کی۔
- عطارد جو سورج سے قریب ترین سیارہ ہے اپنے محور پر ایک گردش ۵۹ دن میں مکمل کرتا ہے۔
- شاہ جارج سوم ۵۹ برس تک برطانیہ کا بادشاہ رہا اور ایک مرتبہ بھی اپنے ملک سے باہر نہیں گیا۔
- اگر باکسنگ کا ایک مقابلہ ۱۵ راؤنڈ تک جاری رہے تو اس مقابلے میں کل ۵۹ منٹ صرف ہوں گے۔
- شاہ ولی اللہ کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۹ برس تھی۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام جنوری ۱۸۷۷ء میں عمل میں آیا۔ اس وقت سرسید کی عمر ۵۹ برس تھی۔

(۶۰)

- فتح مکہ کے وقت آنحضرتؐ کی عمر مبارک ۶۰ سال ۶ ماہ تھی۔
- جہانگیر نے اپنے محل پر جو زنجیر عدل آویزاں کی تھی اس میں ۶۰ گھنٹیاں تھیں۔
- ایک مساوی الاضلاع مثلث میں ہر زاویہ ۶۰ درجے کا ہوتا ہے۔
- علامہ اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۰ برس تھی۔
- ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ اور ہر منٹ میں ساٹھ سیکنڈ ہوتے ہیں۔
- شادی کی ساٹھویں سالگرہ کو ڈائمنڈ جوبلی کہا جاتا ہے۔
- نیپچون زمین سے ساٹھ گنا بڑا ہے۔
- حضرت مجدد الف ثانیؒ کا انتقال ۶۰ برس کی عمر میں ہوا تھا۔
- انسانی جسم میں اتنی گندھک ہوتی ہے کہ اس سے ماچس کی ساٹھ ڈبیاں تیار ہو سکتی ہیں۔
- کبوتر ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑ سکتے ہیں۔

ننھی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے اِنتخاب

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بار ہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بددیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

حمد باری تعالیٰ

محمد رضوان، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سب سے بڑھ کر ہے مہربان خدا
میرا تیرا ہے پاسبان خُدا
اُس نے ہم کو حیات بخشی ہے
اور یہ کائنات بخشی ہے
پتّے پتّے میں وہ دمکتا ہے
ذرّے ذرّے میں وہ چمکتا ہے
اُس کی حکمت کو ہر کوئی جانے
اُس کی قُدرت کو ہر کوئی مانے
وہ پریشانیاں مٹاتا ہے
وہ خوشی کے کنول کھلاتا ہے

درس

کاشف آزاد
راولپنڈی

"مجھے نفرت ہے مُنّے سے۔۔۔"

یہ فقرہ کہتے ہوئے انور گھر سے نکل گیا۔

منّا انور کا چھوٹا بھائی تھا۔ جو انور سے تین سال چھوٹا تھا۔ انور کا خیال تھا کہ منّے کی وجہ سے اُس کی اہمیت کم ہو گئی ہے اور اُسے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ صرف انور ہی کا خیال تھا، حالانکہ اُس کے امی ابو دونوں پر برابر توجہ دیتے تھے۔ اسی غلط خیال کی وجہ سے وہ اکثر مُنّے سے لڑتا رہتا اور اس کے کھلونے اُس سے چھین لیتا یا توڑ دیتا۔

انور غصّے میں گھر سے نکل کر فیشنل پارک کی طرف چلا گیا اور کئی گھنٹے تک وہاں بلا مقصد بیٹھا رہا۔ شام کو انور نے گھر کا رُخ کیا۔ منّا حسبِ معمول کھیل رہا تھا۔ اُس لمحے انور کو مُنّے پر بہت پیار آیا، مگر اُسے یہ سوچ کر پھر غصّہ آگیا کہ اس کی وجہ سے میری کوئی اہمیت نہیں رہی، وہ چُپ چاپ آکر اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ شام کو جب اُس کے ابّو گھر آئے تو انور کی امّی نے اُنہیں سب کچھ بتا دیا۔ جسے اُنہوں نے نہایت تحمّل سے سُنا اور کہا۔

"بیگم یہ نفسیاتی معاملہ ہے۔ میں خود اُسے سمجھاتا ہوں۔"

انور کے ابّو جب انور کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا دیوار پر ٹنگی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ تصویر مُنّے کی ہی تھی۔ انور کے ابّو اُس کے قریب آئے اور اُسے پکارا۔

"بیٹے انور۔۔۔!"

انور نے چونک کر اُنھیں دیکھا اور پھر سلام کیا۔ ابّو انور کے قریب ہی بستر پر بیٹھ گئے۔ اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"بیٹے۔۔۔! آج پھر تم نے مُنّے کو تنگ کیا ہے اور اُس سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اُس کے کھلونے توڑ دیے ہیں۔"

انور نے سر جھکا لیا۔ ابّو پھر شفقت سے بولے۔

"دیکھو! منّا تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ اُس پر تمہارا خراب رویّہ بہت بُرا اثر ڈالے گا۔ دیکھو میں تمہیں اس کی ایک مثال اس طرح دیتا ہوں کہ اگر میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کروں جیسا کہ تم مُنّے کے ساتھ کرتے ہو تو تمہارے دل پر کیا گزرے گی۔ اور ویسے بھی ہمارا مذہب اسلام ہر ایک سے محبت کرنے کا درس دیتا ہے۔ ہمارے پیارے نبیؐ کا ارشاد ہے کہ

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے

دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"

ہمارے پیارے نبیؐ تو ہر ایک سے محبت کا درس دیتے ہیں۔ لیکن تم تو منّے سے بھی نفرت کرتے ہو۔"

انور نے اپنے ابو کی باتوں کو اپنے پلّے سے باندھ لیا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے پیارے نبیؐ کے احکام کے مطابق ہر انسان سے محبت کرے گا اور ہر ممکن کوشش کرے گا کہ اُس کے ہاتھ اور زبان سے کسی مسلمان کو نقصان نہ پہنچے۔

اگلی صبح گھر والوں نے انور کو ایک بدلا ہوا انسان پایا۔ جو منّے سے خوب پیار کر رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے اُس نے منّے کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ آج اُسے بھی اپنا سینہ بہت کشادہ معلوم ہو رہا تھا۔

لکھنا لکھانا کھیل نہیں ہے

انور کلیم بلوچ شہداد کوٹ

اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کیوں لکھتے ہو؟ صاف صاف کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہیں کہانیاں وغیرہ لکھنے سے کتنے پیسے کا فائدہ پہنچتا ہے؟ تو عرض ہے کہ جس طرح معدے کو خوراک کی اور جسم کو حرکت کی ضرورت ہوتی ہے اُسی طرح دماغ کو بھی کسی نہ کسی مصروفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے بعض لوگ پتنگ بازی کا شوق رکھتے ہیں۔ اور بعض کبوتر بازی کا چند ایک شرارتی ہوتے ہیں اور اور چند اُن سے بھی دو ہاتھ آگے۔

میں خُدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ بجائے کسی اور نشہ یا فضول قسم کی مصروفیت کے میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔

میں چھ سات برس سے مسلسل لکھتا آ رہا ہوں اور ہمیشہ سے یہی ہوتا آ رہا ہے کہ اگر کبھی کوئی خواب بھی دیکھا تو غور کرنے لگے کہ کس طرح اس پر ایک کہانی لکھی جا سکتی ہے؟ ایسا تو کئی بار ہُوا کہ کسی نے پوچھا "یار گھر میں بچّہ ہُوا ہے کوئی اچھا سا نام تو بتاؤ؟" اِدھر ہمارے ذہن میں صرف کہانیوں کے نام ہوتے لہٰذا ہمارا جواب کچھ اس طرح ہوتا "مہنگا قاتل" یا "کرائے کا بدمعاش" اور اگر کسی دوست

عزیز کے کردار پر کوئی کہانی لکھی اور اگر اُسے پسند نہ آئی تو لیجیے صاحب دوستی تو گئی۔

کہانی لکھنے کے لیے کسی انگریز مصنف نے کیا خوب لکھا تھا کہ لکھنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے کاغذ اور قلم کی... کاغذ کی قیمت ایڈیٹروں کو اُس وقت مہنگی نظر آتی ہے جب رسالے کی قیمت بڑھانا ہوتا ہے۔ ہم لکھنے والے ایک کہانی کے لیے کم از کم ایک روپے کا کاغذ ضرور خریدتے ہیں۔ اور اگر کاپی یعنی بُک خریدتے ہیں تو اور بھی مہنگا پڑتا ہے۔ پھر قلم اور سیاہی بھی ضروری ہیں۔ کہانی لکھ چکے تو مسئلہ ہے لفافے کا۔ بعض اوقات محکمۂ ڈاک کا لفافہ خریدتے ہیں جو کہ بازار میں ایک روپے کا ملتا ہے لیکن ان کا سائز چھوٹا ہے۔ اس لیے عموماً بازار سے بیرنگ خاکی لفافہ خریدتے ہیں جو کہ ۳۰ پیسے میں ملتا ہے۔ اور اس ڈر سے کہ محکمہ ڈاک اسّی پیسے کے ٹکٹ میں اُسے قبول کرنے سے انکار نہ کر دے اس پر ایک روپے کے ڈاک ٹکٹ لگاتے ہیں۔ میں کم از کم تین چار رسائل اور دو ہفت روزہ جرائد میں لکھتا ہوں۔ ان سب کو مواد بھیجنے پر مجموعی طور پر جو خرچہ آتا ہے اس کا حساب آپ خود کر لیں۔ پھر کہانی جس شمارے میں چھپتی ہے۔ عام طور پر

اپنی نگارشات صاف، خوشخط، کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔

ریکارڈ رکھنے کے لیے اس کے دو شمارے خریدتا ہوں۔ اُن پر جلد چڑھانے کا خرچہ بھی...

اور اگر مارکیٹ میں کوئی اچھی سی کتاب آجائے تو اُسے بھی خریدنا پڑتا ہے۔

پیسے کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے اور ہمارا ذریعۂ آمدنی کیا ہے؟ صرف محدود سا جیب خرچ؟

یہ تو حساب کتاب میں نے پیش کر دیا یہ ہر لکھنے والے کا حساب کتاب ہے اب اگر آپ ایڈیٹر صاحب سے بھی حساب کتاب مانگ لیں کہ چمکتے دمکتے رسالے سے جو پیسہ بچتا ہے وہ اس میں سے کتنا پیسا اپنے بچوں کو وڈیو خرچہ دیتے ہیں؟ کتنا بیروں کو ٹپ دیتے ہیں اور... اگر پیسہ نہیں تو لکھنے والوں... خاص طور پر نئے لکھنے والوں کو کتنے اعزازی شمارے دیتے ہیں؟

اندھیرے میں

مشہر یار۔ ناظم آباد، کراچی

ایک بڑے شہر کے ایک علاقے میں جو کچی

آبادی کہلاتا ہے اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ یہ علاقہ کچے پکے مکانوں پر مشتمل ہے، جہاں چوڑی اور تنگ گلیاں ہیں ایک سڑک جو تقریباً ۲۰ فٹ یا اس سے کچھ زیادہ چوڑی ہے اس علاقے کے اندر تک چلی جاتی ہے۔ اس وقت رات کے ۹ بجے ہیں۔ اس علاقے کی بجلی چلی گئی ہے اس وجہ سے پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس وقت یہاں بڑا پُرسکون ماحول ہے۔ چاند اپنی آب و تاب سے چمک رہا ہے اور اس کی دودھیالی روشنی پورے علاقے پر پھیلی ہوئی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے وہ بھی مناسب رفتار کے ساتھ، نہ اتنی تیز کہ اس سے دُھول اُڑے، اور نہ ہی اتنی ہلکی کہ محسوس ہی نہ ہو، کیونکہ یہ گرمیوں کا مہینہ ہے، اس لیے یہ ہوا یہاں کے باشندوں کے لیے خاص طور پر اس وقت ایک بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ جب غریبوں کے علاقوں میں لائٹ چلی جاتی ہے تو کئی گھنٹے گزرنے کے بعد بھی نہیں آتی اور بعض دفعہ تو اتنی جلدی آجاتی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا کہ لائٹ آگئی ہے۔ کیونکہ اس وقت اس علاقے میں لائٹ کافی دیر سے گئی ہوئی ہے۔ اس لیے بہت کم امکان ہے کہ لائٹ صبح سے پہلے آئے گی۔ گرمی کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کے آگے چارپائی ڈال لی ہے۔ بعض گلیوں میں گٹر ابلنے کی وجہ سے گٹر کا گندا پانی باہر بہہ رہا ہے جس کی وجہ سے گندے پانی کی بدبو دُور تک محسوس کی جاسکتی ہے۔

بچے گلیوں میں کھیلنے میں مصروف ہیں۔ اس علاقے کے وسط میں ایک چوک ہے جس میں ایک ہوٹل ہے، اس ہوٹل میں بہت سی گیس بتیاں جل رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے چوک میں اچھی خاصی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت چوک میں لائٹ جانے کی وجہ سے اور زیادہ رونق نظر آرہی ہے۔ چوک میں پھل والوں کے ٹھیلے بھی کھڑے ہیں۔ جہاں سے لوگ پھل خرید رہے ہیں۔ پان کی دکانوں پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ دکانوں کے چبوتروں پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں کوئی سیاسی باتیں کر رہا ہے تو کوئی ___ گھریلو مسائل کا تذکرہ کر رہا ہے۔ اور کوئی اپنے ماضی کے واقعات سُنا رہا ہے، لوگ بے فکر ہو کر باتوں میں مصروف ہیں ویسے بھی آج جمعرات کی رات ہے۔ اس وقت ویڈیو والوں کی دکانوں پر سناٹا چھایا ہوا ہے اور ویڈیو کی دکانوں کے مالک اس طرح منہ بنائے ہوئے ہیں، جیسے ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا ہو۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے۔ خاموشی بڑھتی جا رہی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کسی ٹیکسی یا رکشے کی آواز اس خاموشی کو کچھ دیر کے لیے توڑ دیتی ہے۔

ننّھے کی دُعا

ندیم محمود ـــــــ بیڈن روڈ لاہور

کرسی پر کسی کلاس کی تنہا
بچّہ تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ ٹیسٹ سر پہ آئے
کھیلنے کودنے میں دن گزارے
پاس کس طرح سے ہُوں کیمیا میں
آنکھوں میں چھاگیا اندھیرا
سُن کر بچّے کی آہ وزاری
اِنک ربر کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں میں دل وجاں سے مدد کو
ربڑ ہُوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو تم نے پڑھا نہیں کچھ
میں رزلٹ تمہارا اچّھا کردُوں گا
ہیں رَبر وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے
(شاعرِ مشرق کی رُوح سے معذرت کے ساتھ)

معلومات کی محفل

سیّد یوسف نصراللہ، ڈیفنس، کراچی

۱۔ دنیا میں سب سے زیادہ مسجدیں استنبول میں واقع ہیں۔

۲۔ مُرغوں کی لڑائی کا رواج سب سے پہلے مُلک چین سے ہوا۔

۳۔ سوڈیم اور پوٹاشیم دونوں پانی میں جلتے ہیں۔

۴۔ روس میں سب سے بڑے دریا کا نام وولگا ہے۔

۵۔ سب سے لمبی جنگ ۱۳۳۸ء سے لے کر ۱۴۵۳ء برطانیہ اور فرانس کے درمیان لڑی گئی۔ اسے صد سالہ جنگ بھی کہا جاتا ہے۔

۶۔ زمین گول ہونے کا پتہ سب سے پہلے یونانی فلسفی فیثاغورث نے چلایا۔

۷۔ پاکستان میں سب سے بڑی جھیل کا نام منچھر جھیل ہے۔

۸۔ پاکستان میں زمرّد کی کانیں سوات میں ہیں۔

۹۔ کراچی کو روشنیوں کا شہر کہا جاتا ہے۔

۱۰۔ کوہِ قاف رُوس میں واقع ہے۔

۱۱۔ فِن لینڈ وہ مُلک ہے جس کا ۱/۱ حصّہ جھیلوں پر مُشتمل ہے۔

۱۲۔ بحرالکاہل ۳۶۱۹۸۰ فٹ گہرا ہے۔

۱۳۔ اگاتھا کرسٹی کو جرائم کی کہانیوں کی ملکہ کہا جاتا ہے۔

۱۴۔ آندھی اور بادلوں کے گرجنے کی رفتار کا اندازہ لگانے کے لیے جو آلہ استعمال ہوتا ہے، اُسے اینومیٹر (باد پیما) کہتے ہیں۔

۱۵۔ مسلمان جہازران ابنِ ماجہ نے قُطب نما

ایجاد کیا۔

۱۶۔ دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن ہے۔

۱۷۔ دنیا کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا رسالہ "ریڈرز ڈائجسٹ" ہے۔

۱۸۔ پولیس کا محکمہ حضرت عمرؓ کے عہد میں قائم ہوا۔

۱۹۔ مینارِ پاکستان ۱۹۶ فٹ بلند ہے۔

۲۰۔ سب سے بڑا پرندہ افریقہ کا گولڈن ایگل ہے۔

۲۱۔ شکاگو امریکہ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔

۲۲۔ حضورِ اکرمؐ، حضرت اُمِ ایمنؓ کو اپنی ماں کہا کرتے تھے۔

۲۳۔ پاکستان کی واحد خاتون سائنسدان ڈاکٹر نسیمہ ترمذی ہیں

۲۴۔ پاکستان کا سب سے بڑا دریا، دریائے سندھ اور سب سے چھوٹا راوی ہے۔ راوی دریائے سندھ ہی کی ایک شاخ ہے۔

۲۵۔ قرآن نے حضرت یوسفؑ کے قصے کو "احسن القصص" کہا ہے۔

۲۶۔ پاکستان کے پہلے چیف جسٹس میاں عبدالرشید تھے۔

۲۷۔ "حضرتِ انسان" علامہ اقبالؒ کی آخری اُردو نظم ہے۔ جو آپ نے ۷ فروری ۱۹۳۸ء کو لکھی۔

۲۸۔ دنیا کا قدیم ترین پرچم ڈنمارک کا ہے۔ جو ۱۲۱۹ء سے چلا آرہا ہے۔

۲۹۔ سات دنوں کا ہفتہ بنو اسرائیل کی قوم نے مقرر کیا۔

۳۰۔ قوس قزح (دھنک) میں سات رنگ ہوتے ہیں۔

۳۱۔ بقراط کو بابائے طب کہا جاتا ہے۔

۳۲۔ عمرانیات کا بانی علامہ ابنِ خلدون کو کہتے ہیں۔

۳۳۔ فلپائن کو "زلزلوں کی زمین" کہا جاتا ہے۔

۳۴۔ عراق کا پرانا نام میسوپوٹیمیا تھا۔

۳۵۔ سب سے تیز رفتار جانور، سیاہ چیتا ہے۔

۳۶۔ حضرت امیر خسروؒ کو طوطیٔ ہند کہا جاتا ہے۔ آپ اُردو کے پہلے شاعر تھے۔

۳۷۔ ۱۷ اگست کو انڈونیشیا کا یومِ آزادی منایا جاتا ہے۔

۳۸۔ انڈونیشیا تین ہزار جزائر پر مشتمل ہے۔

سقراط

ساجد احمد خان، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سقراط سوالات کرنے اور سوالات کا جواب دینے میں بہت ذہین و طباع تھا۔ افسوس یہ ہے کہ اُس نے کوئی لکھی ہوئی تصنیف نہیں چھوڑی، جس سے اس کے علم کا اندازہ کیا جاسکے۔ ہمیں اُس کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ اُس کے دو شاگردوں کے طفیل سے ہے۔ ایک زینوفن یعنی وہ جرنیل جس نے مشہور کتاب "انابسس" لکھی اور دوسرا افلاطون، جس نے فلسفیانہ مکالمات لکھے۔ اور اُن میں صرف سقراط کے اقوال نقل کیے۔ اپنا کوئی قول نہیں لکھا۔ زینوفن کو تو غالباً ایک خالص فکری ذہن کے خلاف وہی تعصب تھا جو فوجیوں کو

ہُوا کرتا ہے حالانکہ سقراط خود ایتھنز کے ایک سپاہی کی حیثیت سے نام پیدا کر چکا تھا۔ اور افلاطون کی کیفیت یہ ہے کہ شاید اُس نے اپنے بوڑھے اُستاد کے منہ میں خود اپنے الفاظ ڈال دیے۔ سقراط ۴۶۹ ق قبل مسیح کے قریب ایتھنز میں پیدا ہُوا۔ اُس کا باپ سنگتراش تھا اور ماں دائی تھی۔ انہوں نے بیٹے کو علم ہندسہ، فلکیات، موسیقی اور پہلوانی کی تعلیم دلائی۔ یونان میں انہی علوم کا رواج تھا۔ سقراط کی نوجوانی کے زمانے میں ایتھنز میں بہت سے سوفسطائی فلسفی موجود تھے۔ سقراط اُن سے اکثر ملاقاتیں کرتا اور برابر سوالات پوچھتا۔ اس طرح اُس نے اپنے علم میں بہت اضافہ کر لیا۔

فوجی خدمت کے زمانے میں صرف یہی ثابت نہیں ہُوا کہ سقراط بہت بہادر تھا۔ بلکہ وہ موسم کی خرابی اور تکان کی بھی بالکل پرواہ نہ کرتا۔ اس کے بعد سقراط نے علم و حکمت کی طرف توجہ کی۔

اُس کی زندگی بے حد سادہ تھی۔ اُسے آرام و آسائش کے سامان سے نفرت تھی۔ وہ صرف ایک کپڑا پہنتا اور موٹا جھوٹا کھانا کھاتا۔ زینوفن لکھتا ہے کہ اُس کی بیوی نہایت تُند مزاج اور لڑاکا عورت تھی، لیکن سقراط اپنے آپ کو ضبط و صبر سکھانے کے لیے اُس عورت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کے تمام دوست لکھتے ہیں کہ سقراط خود بدشکل انسان تھا۔ سقراط کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ علم پھیلایا جائے۔ اُس کا اعتقاد تھا کہ علم ہی سے اخلاقی کردار پیدا ہوتا ہے۔ اُس کا اصول یہ تھا "نیکی علم ہے، بدی جہالت ہے"۔ اُس کا طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ گفتگو کرو، سوالات کرو، جواب دو اور جواب لو اور بار بار بحث مباحثہ کرو تا آنکہ مسئلے کے تمام گوشے سامنے آجائیں۔

۳۹۹ ق قبل مسیح میں ایتھنز کے حکام نے سقراط کے خلاف یہ الزام لگائے کہ وہ پُرانے دیوتاؤں کی پرواہ نہیں کرتا۔ نئے دیوتاؤں کا تعارف کرا رہا ہے۔ اور نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر رہا ہے۔ اس طرح چند ووٹوں کی کثرت سے وہ مجرم قرار دیا گیا اور اُسے حکم دیا گیا کہ وہ زہر کا پیالہ پی لے۔ سقراط نے اپنی زندگی کا آخری دن اپنے دوستوں کے ساتھ باتیں کرنے میں گزارا اور شام کو نہایت سکون و وقار کے ساتھ زہر کا پیالہ پی کر جان دے دی۔

کاش

آج پھر بڑھاپے میں فضل کو اپنے بچپن کے اکثر دن یاد آرہے تھے۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ کاش وہ تعلیم حاصل کر لیتا تو آج اُس کو یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔ اُس کو اچھی طرح یاد آرہا تھا کہ وہ بچپن میں جب تعلیم حاصل کیا کرتا تھا تو وہ اپنی کلاس کا ذہین ترین طالب علم تھا، مگر ایک دن اُس کی کلاس میں چند نئے لڑکے داخل

ہوئے۔ وہ لڑکے آوارہ اور پڑھائی میں بالکل نالائق تھے۔ انھوں نے جلد ہی فضل سے دوستی کرلی تھی۔ وہ لڑکے پڑھائی میں بالکل دھیان نہ دیتے تھے۔ کیونکہ یا وہ سارا دن کھیلتے رہتے یا سارا سارا دن آوارہ پھرتے رہتے تھے۔ اب آہستہ آہستہ انھوں نے فضل کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور فضل بھی اُن کی صُحبت میں بیٹھ کر اب پڑھائی سے جی چُرانے لگا تھا۔ سالانہ امتحان ہوا تو ہر امتحان میں اوّل آنے والا لڑکا امتحان میں بُری طرح فیل ہو چکا تھا اب مارے شرمندگی کے فضل نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ یعنی پڑھائی کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کے والدین نے اس کو لاکھ سمجھایا کہ تعلیم حاصل کرنی نہ چھوڑو اگر اس دفعہ تم فیل ہو گئے ہو تو اگلی دفعہ زیادہ محنت کرکے پاس ہو جانا۔ کیونکہ اگر تم نے پڑھنا چھوڑ دیا تو زندگی خراب ہو جائے گی، مگر فضل پر تو کوئی کام سیکھنے کی دُھن سوار تھی۔ فضل کی مرضی سے اُس کے والدین اُس کو اُس کے پسند کے کام پر ڈال دیا، مگر چند دن کام سیکھنے کے بعد فضل کا جی اس کام سے بھی اُکتا گیا۔ اسی طرح دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل گئے۔ فضل نے دوبارہ تعلیم حاصل نہ کی اور کوئی ہُنر بھی نہ سیکھا۔ اور اب اُسے کھانے کے لیے روٹی نہیں مل رہی تھی۔ کیونکہ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ والدین وفات پا چکے تھے اور بہن بھائیوں نے اُس سے منہ پھیر لیا تھا کیونکہ وہ غریب تھا۔ اب حال یہ تھا کہ وہ محنت مزدوری کرتا تھا۔ تو کبھی ملتی تو کرلیتا ورنہ دو دو تین تین دن بھُوکا رہتا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ کاش میں نے اُس وقت سب کا کہا مان لیا ہوتا تو اور تعلیم حاصل کرلی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنے نہ پڑتے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا" اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت"

اس لیے بچّو! ہم سب کو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے تعلیم حاصل کریں۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے، بُرے بچّوں کی صُحبت سے بچنا چاہیے، کہیں وہ ہمارا تعارف نہ بن جائیں

تو جان بیچ کر بھی جو علم و ہُنر ملے
جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

مصنوعی سیّارے

خرّم معراج - پُرانا سکھر

بچّو! آپ نے ٹیلی وژن پر کئی

میچ براہِ راست دیکھے ہوں گے۔ جس میں دکھایا جاتا ہے کہ انگلستان کے شہر لندن یا دوسرے مُلک کے کسی دوسرے شہر سے براہِ راست! اور یہ میچ صرف مواصلاتی سیارے کے ذریعے ہی براہِ راست دکھایا جاتا ہے۔ اِسے ہم مصنوعی سیارہ بھی کہتے ہیں۔

مصنوعی سیارہ انسان کی بنائی ہوئی کسی ایسی چیز کو کہتے ہیں جسے زمین کے گرد ایک خاص فاصلے پر گردش کرنے کے لیے فضا میں چھوڑا جائے۔ خلا میں جو مشاہدے اور تجربے مصنوعی سیارے کے ذریعے کرنا ہوں۔ اُن کو مدِ نظر رکھ کر مناسب آلات مصنوعی سیارے میں لگائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلا مصنوعی سیارہ ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو زمین کے گرد مدار میں بھیجا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک بے شمار مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ابھی تک زمین کے گرد چکر لگائے جاتے ہیں۔ کئی مصنوعی سیارے چاند، زہرہ مرّیخ وغیرہ کی طرف بھی روانہ کیے گئے ہیں۔

مصنوعی سیارے کو مطلوبہ بلندی تک لے جانے اور اُسے ضروری رفتار دینے کے لیے راکٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنوعی سیارے موسمی حالات کا پتا چلانے کے کام بھی آتے ہیں۔ آج کے دور میں مصنوعی سیارے ہر ملک کی اہم ضرورت ہیں۔

دُشمن سے لڑائی میں

محمد ارشد صابر۔ قادر پور راں

قصائی نے کہا، میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔
درزی نے کہا، میں تیرے بخیے اُدھیڑ دوں گا۔
ڈینٹر نے کہا، میں تیرے ڈینٹ نکال دوں گا۔
مستری نے کہا، میں تیرے نٹ کس دوں گا۔
ڈرائیور نے کہا، میں تجھے ٹائر کے نیچے کچل دوں گا۔
دھوبی نے کہا، میں تجھے نچوڑ کر رکھ دوں گا۔
دُودھ والے نے کہا، چھٹی کا دُودھ یاد دلا دوں گا۔

کسے کہتے ہیں

مرسلہ: محمد نعمان۔ لیاقت آباد

جدید ہیئت کا بانی ـــــ کوپرنیکس
جدید علم العلاج کا بانی ـــــ پیراسیل سس
میکانیات کا بانی ـــــ گلیلیو گلیلی
کیمیا کا بانی ـــــ رابرٹ بوائل
جدید فلسفہ کا بانی ـــــ دینی دیکارتے
عمرانیات کا بانی ـــــ ابنِ خلدونؒ
قُدرتی فلکیات کا بانی ـــــ جاہن کیپلر
جدید فلکیات کا بانی ـــــ کوپرنیکس
بابائے تاریخ ـــــ ابنِ خلدونؒ
بابائے باکسنگ ـــــ جان بروٹن
بابائے فلم ـــــ گرونتھ

بابائے اُردو ـــــــ مولوی عبدالحق
بابائے سائنس ـــــــ ارسطو
بابائے علم و تشریح ـــــــ حکیم جالینوس

کہاوتیں

مرسلہ : پرنس وسیم بن اشرف ۔ میاں چنوں

۱۔ تجربہ وہ کنگھی ہے ۔ جسے زندگی ہمیں ایسے وقت دیتی ہے، جب ہمارے بال جھڑ جاتے ہیں۔
(بلجیم کی کہاوت)

۲۔ جہاں صداقت اور خلوص نظر آئے، وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ ۔ ورنہ تمہاری تنہائی ہی بہترین رفیق ہے
(ایرانی کہاوت)

۳۔ اپنی خواہش کو دل میں ہی غرق کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دل اس میں ڈوب جائے ۔
(عراقی کہاوت)

۴۔ الفاظ کے پیچھے مت بھاگو ۔ بلکہ خیالات تلاش کرو ۔ جب خیالات کا ہجوم ہو گا تو الفاظ خود بخود مل جائیں گے۔ (یونانی کہاوت)

۵۔ بغیر دیکھے نہ کوئی چیز منہ میں ڈالو اور بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرو ۔ (اسپین کی کہاوت)

۶۔ اگر سڑک پر چلتے ہوئے گاڑی سامنے آجائے تو سڑک کے کنارے تک ہٹ جاؤ ۔ گھوڑا گاڑی ہو تو پانچ گز تک ہٹنا ضروری ہے ۔ ہاتھی ہو تو دس گز تک لیکن اگر کسی بُرے آدمی کا آمنا سامنا ہو جائے تو فوراً ایک سو گز دُور ہٹ جاؤ ۔
(سری لنکا کی کہاوت)

۷۔ بچھو کی دُم میں زہر ہوتا ہے، سانپ کے دانت میں اور مچھر کے سر میں لیکن بُرے آدمی کے پورے وجود میں زہر ہی زہر ہوتا ہے ۔
(سری لنکا کی کہاوت)

۸۔ نصیحت ایسی چیز ہے جس کی عقلمندوں کو ضرورت نہیں اور بے وقوف قبول نہیں کرتے ۔
(عربی کہاوت)

حاضر جوابی

مرسلہ :۔ فرزانہ لطیف ، حافظ آباد

برنارڈ شا کے ایک ڈرامے کی رسم افتتاح تھی۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد تماشائیوں نے پُرجوش انداز میں تالیاں بجائیں ۔ برنارڈ شا نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ خواتین و حضرات اس ڈرامے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ۔

ایک حاسد نے کہا کہ "نہایت بے ہودہ اور گھٹیا ڈرامہ تھا۔"

برنارڈ شا نے جواب دیا کہ "میرا بھی یہی خیال ہے، لیکن اتنے بڑے ہجوم میں ہم دونوں کی رائے کیا اہمیت رکھتی ہے ۔"

بڑی ہستیوں کے القاب

ایم مظہر ولایت ۔ جھیورانوالی ۔

حضرت محمدؐ ـــــــ صادق ، امین

حضرت ابو بکرؓ	صدیق
حضرت عمرؓ	فاروق
حضرت عثمانؓ	غنی، ذوالنورین
حضرت علیؓ	شیرِ خدا
حضرت خالد بن ولیدؓ	سیف اللہ
محمود غزنوی	بت شکن

علم کی مثال

مرسلہ:۔ نائلہ بختیار، کوہاٹ شہر سرحد

اُستاد اور شاگرد دریائے دجلہ کے کنارے کھڑے تھے۔ اُستاد نے شاگرد سے کہا۔

"گھوڑے کو پانی پلاؤ"۔ شاگرد نے حکم کی تعمیل کی۔ جب گھوڑا اچھی طرح پانی پی چکا تو اُستاد نے شاگرد سے کہا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ کیا گھوڑے کے پانی پینے سے دریائے دجلہ کے پانی میں کوئی کمی ہوئی ہے؟"

شاگرد یہ سوال سُن کر بہت حیران ہوا اور بولا "نہیں جناب پانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے"۔ اُستاد یہ سُن کر بولا۔

"علم کی مثال بھی ایسی ہے کہ اس میں جتنا چاہو خرچ کرو مگر اس میں کمی نہ ہوگی"۔ وہ اُستاد صاحب حضرت سلمان فارسیؓ تھے۔ آپؓ کا اصل نام "مابہ" تھا۔

گزرا ہوا زمانہ

مرسلہ۔ محمد سعید گلاب، کراچی

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
اسکول جانا گھر سے رستے سے لوٹ آنا

اُستاد کے وہ ڈنڈے، اسکول کی وہ گھنٹی
ہے یاد مجھ کو اب تک ماضی کا وہ فسانہ

باغوں میں جا کے سونا، کھانا ہوا چمن کی
وہ گھاس کا بچھونا، پھولوں کا وہ سرہانا

ہم کو خبر نہ تھی جب اپنے بُرے بھلے کی
آزاد زندگی تھی ماحول تھا سہانا

اپنی شرارتوں کو ہم جانتے ہیں اب تک
اسکول جا کے لڑنا، استاد کو ستانا

اے دوستو! نصیحت ہر کام کی یہی ہے
اسکول جا کے پڑھنا، لکھنے میں دل لگانا

بلیک بکس

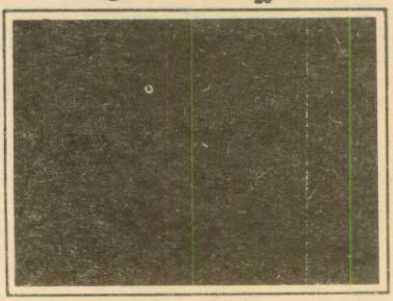

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادیب بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک بکس میں نہ آنے پائے"۔

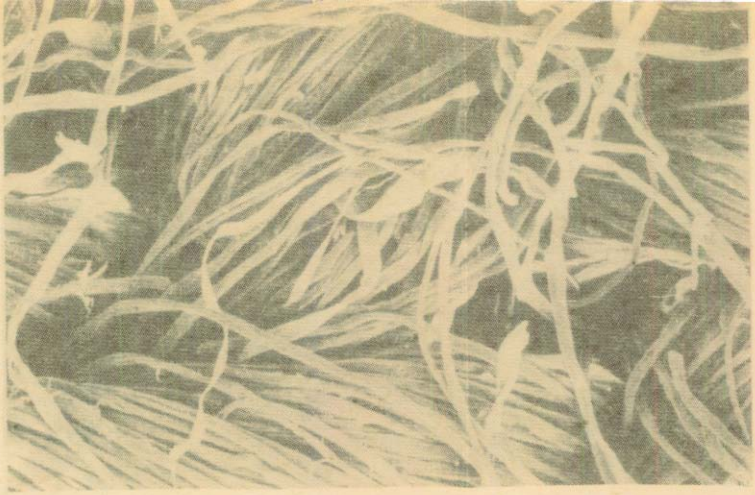

گزشتہ ماہ کے شمارے میں ہم نے یہ تصویر شائع کی تھی اور آپ سے پوچھا تھا کہ یہ تصویر کس چیز کی ہے۔ ہمارے ساتھی اس تصویر کو شناخت نہیں کر سکے۔ لیجیے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ یہ دونوں تصاویر ایک قمیض کے کالر کی ہیں۔۔۔ بس فرق یہ ہے کہ ایک کالر بہت میلا ہے اور ایک بہت اُجلا۔ بہت ہی طاقتور لینس کی مدد سے اس تصویر کو کھینچا گیا تو کالر کے دھاگے سوئیوں کی طرح نظر آنے لگے۔

"کوئٹہ سے محمد عثمان جعفر نے ان سوئیوں کو "دھاگہ" بتایا ہے۔ جواب کسی حد تک درست ہے۔۔۔ اُنہیں مبارک باد کے ساتھ انعام بھی روانہ کیا جا رہا ہے۔

سالگرہ کے ساتھی

مئی کے مہینے میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف

محمد تسکین یونس، دہم
پانچ مئی ۱۹۷۲ء
مضمون ریاضی
آرکیٹیکچر بنیں گے۔ محمد تسکین یونس ولد محمد یونس لوڈ افشین ۲ گلی نمبر ۴ مسلم کالونی کمہار کالونی ملتان

اعجاز علی شیخ، ہفتم الف
۲۳ مئی ۱۹۷۶ء
آنکھ مچولی پڑھنا، کرکٹ کھیلنا، اسلامیات، ٹیچر
مکان نمبر اے ۹۴۰ شاہی بازار پرانا سکھر

شوکت غلام محمد پنجم
۹ مئی ۱۹۷۸ء
کرکٹ، اردو، سائنسدان
بلاک ۱۳ - B
گلشن اقبال ۱۸/ ۵ - ۵ - کراچی

محمد وارث رند، ہشتم
۱۰ مئی ۱۹۷۴ء
فٹبال کھیلنا، اردو
وکیل بننا چاہتا ہوں
گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ اللہ یار۔ بلوچستان

ریاض احمد، نہم
۴ مئی ۱۹۷۶ء
اردو، قلمی دوستی
گورنمنٹ ہائی اسکول روڈ
ضلع نواب شاہ

شیام کمار، ہشتم سندھی
۶ مئی ۱۹۷۶ء
بڑوں کی عزت کرنا اور
جو والدین بنانا چاہیں، اردو۔ منوج آٹوز شاہی
بازار نزد دلنشاط سینما شہداد کوٹ ضلع لاڑکانہ سندھ

اعجاز احمد، دہم
۵ مئی ۱۹۷۳ء
کرکٹ کھیلنا، آنکھ مچولی
پڑھنا، بیالوجی، بڑے افسر بنیں گے۔
ضلع ایبٹ آباد تحصیل ہری پور کھلابٹ ٹاؤن شپ سیکٹر ۳

شوکت جاوید، ہشتم
۹ مئی ۱۹۷۳ء
کرکٹ کھیلنا، رسائل پڑھنا
سائنس، پائلٹ۔ مسان روڈ نزد سبحان اللہ
مسجد مکان نمبر ۳۶۳۱ - کیماڑی، کراچی

محمد اعجاز، دہم
۱۱ مئی کرکٹ
کھیلنا، انگلش
ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں مکان نمبر ۶۶،
بلاٹ نمبر ۸۸ گلی نمبر ۱ غریب آباد، حیدر آباد

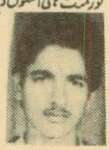

عبدالرحیم ظفر ، دہم
۴ ، مئی ۱۹۷۳ء
قلمی دوستی ، کیمسٹری

عبدالودود خرم ، نہم
۱۳ ، مئی ۱۹۷۵ء
ٹکٹ اور سکے جمع کرنا

محمد حاجی اسماعیل ستار درویش
دہم ۶ ، مئی ۱۹۷۰ء ، اردو
ڈرائیونگ کرنا ، کمپیوٹر سیکھنا

فوجی بنا چاہتا ہوں ۔ شفقت کلینک ، شوکت حساب ، انجینئر برنس مین بنا چاہتے ہیں ۔ بزنس روڈ دہلی
کالونی ۔ ٹنڈو محمد خان ، حیدرآباد آر ۔ ۹۵ سیکٹر ۱ ے/۱۶ گلشن وسیم نارتھ کراچی بلاک بی ۔ ۶ عرشی اسکوائر ، فرسٹ فلور ۔ کراچی

جاوید شبیر بربرا ، ہشتم
مئی ۱۹۷۴ء
آنکھ مچولی پڑھنا ، ریاضی

محمد الیاس ، دہم
۵ ، مئی ۱۹۷۲ء
قلمی دوستی کرنا ۔ ویڈیو گیم

محمد علی ، دہم
۱۰ ، مئی ۱۹۷۴ء
قلمی دوستی ، کہانیاں پڑھنا

جج بننا پسند ہے ۔ کھیلنا ، فزکس ، انگلش ، پروفیسر برائے فزکس انگریزی ، حساب ، میجر (فوجی)
نزد ٹاؤن کمیٹی علی پور ضلع مظفر گڑھ گلی نمبر ، مکان ۔ ۴۰۰ ۱۲ قذافی روڈ مصطفےٰ آباد دھرم پورہ لاہور ۶۹۰/۲۸ عادیاسر سوسائٹی فیز نمبر ۲ بلیر کالونی کراچی

عابد خان ، نہم
۶ ، مئی ۱۹۷۳ء
سائنس ، ڈاک ٹکٹ جمع

عادل اشرف قریشی عرف علی عمران
نہم ۔ ۱۵ ، مئی ۱۹۷۴ء
کرکٹ کھیلنا اور کرکٹ کے

محمد شمیل ، نہم
۲۵ ، مئی ۱۹۷۶ء
سائنس ، اسکاؤٹنگ

کرنا ، انگلش ، ڈاکٹر بنیں گے ۔ ریکارڈ جمع کرنا ، اردو ، مطالعہ پاکستان ۔ ۔ ۔ یا ڈپٹی کمشنر کمانڈو بنیں گے ۔ مکان ۲۱۴۲/۲ ریتہ
معرفت محبوب راشن شاپ ۱۴۴ پرانا مظفر آباد کالونی لانڈھی کراچی مکان ۶۴۳ ، بلاٹ ۳۹ ، لیاقت کالونی حیدرآباد سندھ پلاٹ شاہ فیصل کالونی کراچی نمبر ۲۵ ۔

مئی کے مہینے میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف شامل اشاعت ہے ۔ ممکن ہے ان میں بہت سے ساتھی ایک ہی تاریخ کو پیدا ہوئے ہوں ۔ اس طرح گویا یہ سب سالگرہ کے ساتھی ہوئے ۔۔۔ آپ بھی سالگرہ کے ساتھی میں اپنا نام تصویر اور مکمل تعارف شائع کرواسکتے ہیں مگر اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ان باتوں کا خیال رکھا جائے (۱) آپ صرف اسکول کے طالب علم ہوں ۲ آپ کی تصویر واضح اور پاسپورٹ سائز کی ہو ۳ کوپن ضرور بھجوائیں ۴ کوپن میں ماہ پیدائش کے علاوہ تاریخ اور سن بھی ضرور لکھیں ۔
۵ براہِ کرم طالبات اپنا تعارف نہ بھجوائیں

نام ــــــــــــــــ	جماعت ــــــــــــــــ
تاریخ ماہ و سنِ پیدائش ــــــــ	مشاغل ــــــــــــــــ
پسندیدہ مضمون ــــــــ	بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ــــــــ
پتہ ــــــــــــــــ	

امّی ابّو کا صفحہ

ش۔ فاروقی

دُنیا کے تمام مہذب اور ترقی یافتہ معاشروں میں بچّوں کی تعلیم کے ضمن میں ہر مرحلے پر بچّوں کے ذہنی رجحانات کو اوّلین اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ترقی پذیر معاشروں میں مخصوص معاشرتی معیارات اور والدین کی اپنی خواہشات اور پسند و ناپسند بچّوں کے ذہنی میلانات پر فوقیت حاصل کر لیتی ہے۔ ہمارا معاشرہ تعلیم کے ضمن میں بچّوں کے ذہنی رجحانات کو نظر انداز کرنے والے معاشروں میں سے ایک ہے۔

ہمارے یہاں چونکہ مخصوص شعبوں اور پیشوں سے وابستہ افراد جیسے ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ اور اکاؤنٹینٹ وغیرہ مادّی خوشحالی اور بلند سماجی مرتبے کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے اکثر والدین کی خواہش و کوشش ہوتی ہے کہ ان کے بچّے ان ہی شعبوں میں سے کسی ایک کی تعلیم حاصل کریں۔ چاہے اُن کا میلان ان مضامین کی طرف ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں بچّوں کے ذہن میں بچپن ہی سے مسلسل یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ اُنہیں بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟ والدین کے اس رویّے کے کئی ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں جو انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے ملک و قوم کے مفاد میں نہیں۔

مثال کے طور پر عام مشاہدہ ہے کہ جو طلبہ و طالبات اپنے والدین کے کہنے پر اپنے ذہنی رجحانات سے مطابقت نہ رکھنے والے مضامین لیتے ہیں وہ کبھی بھی اُن مضامین میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ بالفرض وہ سخت محنت کر کے اس مضمون میں اچھے نمبر لے بھی لیں تو بھی وہ ان مضامین میں کوئی تخلیقی کام کرنے کے قابل نہیں ہو پاتے۔

والدین کے اس رویّے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ذہین طلبہ کی اکثریت چند علوم کو میسّر آجاتی ہے۔ جس کے باعث دوسرے بہت سے علوم اوسط اور نچلے درجے کی ذہنی صلاحیت رکھنے والے طلبہ پر گزارہ کرتے ہیں۔ جس سے ان علوم کی تعلیم و تدریس کا معیار اور ترقی دونوں متاثر ہوتے ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی طالب علم اپنے والدین کے بنائے ہوئے ذہنی خاکے کے مطابق ڈاکٹر یا انجینئر نہ بن پائے تو وہ ذہنی پراگندگی کا شکار ہو کر کسی آسان سے مضمون کے قابل بھی نہیں رہتا۔

چنانچہ اگر آپ کا بچّہ سائنس کے بجائے آرٹس کے مضامین پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھنے دیجیے۔ زندگی میں اصل مسئلہ تو کسی بھی چیز میں کمال حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ ممکن ہے آپ کا بچہ آرٹس کے مضامین میں کمال حاصل کر کے آپ کی اور اپنی ناموری کا سبب بن جائے۔ یاد رکھیے آپ کا بچّہ ایک خاص بچّہ ہے۔ اس کے ذہنی رجحانات کو نظر انداز کر کے اسے عام بچّہ مت بنائیے۔ بچّے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ذرا دیکھیے کہیں آپ قوم کے مستقبل کو محض اپنی خواہشات کی تکمیل کی خاطر تاریک تو نہیں کر رہے؟

جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا... بتا دو نا!

ناز
پان مصالحہ

ASHRAF PRODUCTS.
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE

LASER DOT